

داستان گو

اشفاق احمد

ای حمید

BIO



دستان گو

اشفاق احمد

اے حمید

نگ میل پبلی کیشنز، لاہور

اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا جو گھر بنایا ہے اس کا نام ”داستان سرائے“ رکھا ہے۔ میں ”داستان سرائے“ کے باغیچے میں بانس کے ایک چھوٹے سے درخت کے سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بانس کی پوریاں ابھی پتلی تھیں اور ان کا رنگ زرد تھا۔ بانس کی یہ قسم ہمارے ہاں بہت کم ہوتی ہے۔ میں نے زرد بانس کے درخت پر ’تھائی لینڈ کے باؤر کے جنگلوں میں دیکھے ہیں۔ جیسے سے اشفاق احمد نے مجھے آواز دی۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”یہ بانس کا پودا تم نے کہاں سے لیا تھا؟“

وہ ہنس پڑا۔

”یہ زرد بانس بیت نام کے جنگلوں میں لگتا ہے۔ ایک نرسری سے مل گیا تھا باہر سردی ہے اندر آ جاؤ۔ چائے آ رہی ہے“

اشفاق احمد نے اپنے مکان کا دیوان خانہ کافی کھلا کھلا بنایا ہے۔ باغیچے کی طرف پیشے کی لمبی دیوار ہے جو سفید جالی دار پردوں سے ڈھکی رہتی ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے میرا کئی بار دل چاہتا ہے کہ اٹھ کر پردہ ہٹاؤں اور باغیچے کو دیکھوں۔ ہم دونوں دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ نوکر چائے بنانے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ میں نے خود چائے بنائی۔ چائے کا رنگ بنا رہا تھا کہ میں بہت اچھی ہوں۔ چائے واقعی اچھی تھی۔ میں نے اس کی تعریف کی تو اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے آج قدسہ نے چائے دم کی ہے“

میں نے کہا۔

”اسی جائے کوئی باذن غائب ہی دم کر سکتی ہے۔ تم اور تمہارا نوکر یہ جائے تیار نہیں کر سکتا“

میں نے کاپی اور ہال پوائنٹ سامنے رکھ لیا۔ سگریٹ سلگایا اور اشتقاق سے کہا۔

”اب تم ان کاپی کوپوں کا ذکر کرو جہاں تکمیل کو کر تم نے اپنا بچپن گزارا۔ تمہارا قصبہ شہر سے کتنی دور تھا۔ کیا وہاں کوئی دروازہ بھی بہتا تھا؟ مجھے اپنے قصبے کے کھیتوں، اُمود کے باغوں، ٹہلی کے درختوں اور تالابوں کے پاس لے چلا تاکہ میں تمہیں وہاں دوڑتے دیکھ سکوں۔ تم بولتے جاؤ“ مجھے جزبات ٹوٹ کر رہ گئی کرتا جاؤں گا۔“

اشتقاق احمد نے بتایا کہ جس قصبے میں وہ پیدا ہوا اس کا نام کتہہ تھا۔ کتہہ فیروز پور شہر سے پچاس میل دور تھا۔

”یہ سکھوں کا حیرت انگیز مقام بھی ہے۔ 92 فی صد آبادی سکھوں کی تھی۔ ایک بہت بڑا گمہ دارہ بھی تھا۔ کتہہ سے دروازے متعلق 73 میل دور تھا۔ یہ ماوسے کا علاقہ تھا اور یہاں کے سکھ ڈاکو بڑے مشہور تھے۔ یہ کروڑ قسم کے لوگ موسیقی والے سکھ تھے۔ یہ مارا ٹنک قسم کا علاقہ تھا۔ بارانی فصلیں ہوتی تھیں۔ نہ جانے کیسے آباد ہو گیا۔ آبادی والی کوئی بات نہیں تھی۔ جمنڈ کریر‘ پھلائی کے درخت عام تھے۔ کہیں کہیں ٹالیاں بھی تھیں۔ اس کتہہ کے قصبے میں ہیرا واری پتی محلہ تھا۔ اس محلے میں ہارا ایک حویل نما مکان تھا۔ ایک منزلہ گھر کے چانک کے سامنے گلی کر اس کریں تو ایک واڑہ تھا جس میں گھوڑے بیٹھیں وغیرہ بندھی ہوتی تھیں۔

میرے میٹرک کرنے کے بعد ہمارے قصبے میں بجلی آئی تھی۔ یعنی تمام

پاکستان سے چار سال پہلے۔ بجلی گھر کے گرد بڑھ گیا ہوا تھا۔ یہاں ایک ٹینس کورٹ بھی تھا۔ تحصیل دار اور تھانیدار وغیرہ یہاں ٹینس کھیلے کرتے تھے۔ کبھی کبھی انگریز ضلع افسر بھی آ جاتا تھا۔ ہم لڑکے اوھر جاتے گھبرانے تھے۔ یہاں دو تالاب بھی تھے۔ بہت بڑے تالاب۔ ان کا پانی صاف کر کے بڑی بڑی پٹکیوں میں جاتا تھا۔ تالاب کے کنارے شریعت‘ جاسن اور ٹالپوں کے درخت تھے۔۔۔۔۔“

اشتقاق احمد میرے سامنے بیٹھا اپنے قصبے کتہہ کی بھٹیوں بازاروں‘ حویلیوں‘ تالابوں‘ ٹالپوں‘ پھلائی کے درختوں اور گھر کے زرد پھولوں کی باتیں کر رہا تھا اور میں اس کی دی دلی ڈائری پر غور خط میں لکھتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے لکھنا بند کر دیا۔ اب میں اشتقاق کو دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے ڈائری رکھ لی ہے۔ میں نے اس کی ڈائری میں کبھی دخل نہیں دیا۔ وہ چاہے جتنی مرضی ڈائریاں رکھ لے۔ جتنی چاہے اپنے چہرے پر لکھیں ڈال لے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں ہیشتہ 1948ء کے اشتقاق احمد کو دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کے بدلے ہوئے چہرے میں ہیشتہ 1948ء کے اشتقاق احمد کا سرخ و سفید شکفتہ اور مروانہ وجاہت والا چہرہ نظر آتا ہے۔ میرے لئے اس کے چہرے میں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا۔

انکا یاد ہے کہ وہ مجھے پہلی بار 1948ء میں لاہور میں ملا تھا۔ ظاہر ہے پاک فی ہاؤس میں ملے اس کے آس پاس کہیں کافی ہاؤس کے قریب ہی ملا ہو گا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے مشہور امریکی ایکٹر کرک ڈگلس یاد آ گیا تھا۔ وہی چوڑا پٹلا چہرہ مضبوط جڑا‘ فراخ ماتھا‘ چمڑے کدھے‘ سرخ و سفید رنگ۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک تاثر تھا۔ کچھ اس قسم کا تاثر‘ جیسے وہ کوئی شرارت کرنے

والا ہے یا کوئی شرارت کر کے آ رہا ہے۔ دوسری بات جو میں نے پہلی ملاقات میں فون کی یہ تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا ہے۔ دلچسپ باتیں کرتا ہے اور اس میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ ہم تقریباً ہم عمر تھے۔ میں بھی نوجوان تھا۔ وہ بھی نوجوان تھا۔ ہمارے ایک ایک یا دو دو افسانے ادبی رسالوں میں چھپ چکے تھے اور ہم نے ادب میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ اپنے اس ادبی مقام کا مجھے بہت دیر بعد جا کر پتہ چلا۔ میں اپنی محبتوں کے جذب میں ڈوبا ہوا تھا اور اسی کیفیت میں افسانے پر افسانے لکھ رہا تھا۔ محبت میں جو میرے دل کی حالت ہوتی تھی میں انسانوں میں اسے بیان کر دیتا تھا۔ ان دنوں میرے پہلے افسانے ”منزل منزل“ کی ہیروئین راجدہ سے میرا بڑا دل گذار رہا تھا۔ لہذا وہ بھی اس کشمیری نژاد لڑکی کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں نے افسانے میں اس کا نام راجدہ لکھا تھا۔ ایک دن میں نے اشفاق احمد سے پوچھا کہ کیا وہ بھی کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے؟ وہ کچھ شرماسا گیا تھا۔ میں نے بھی مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ایک ہفتہ میں آپ کو شروع میں ہی تاویلا چاہتا ہوں کہ میرے مشاہدے اور تجربے کے مطابق اشفاق فیاضی طور پر شرمیلا آدمی ہے۔ اور مجھے اس کا یہ پہلو بھی اچھا لگتا ہے۔ شاید اس لئے کہ محبت میں میں اس کی ضد ہوں۔

میں اشفاق احمد سے 1948ء میں اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ ہاضی کے دھند لگوں پر فکر ڈالتا ہوں تو کچھ جھلکیاں سی ابھرتی ہیں۔ جیسے موسلا وحار بارش کے بعد بادلوں میں دور کبھی کبھی نکلی چٹکی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ جب مشرقی پنجاب سے مہاجرین کے لئے ہونے والے پاکستان میں آ رہے تھے تو وہ والٹن کیمپ میں رجسٹر پر مہاجرین کے نام وغیرہ درج کیا کرتا تھا۔ پھر وہ ملتان چلا گیا اور وہاں

مہاجرین کیمپ میں کام کرتا رہا۔ مگر وہاں زیادہ دیر اس کا قیام نہ رہا اور وہ لاہور آ گیا۔ انہیں نمبر ایک مرنگ روڈ والا مکان الٹ ہو چکا تھا۔ اس مکان کی تین چار حویلیں تھیں اور ایک زید پر حویلی سے ہوتا ہوا اوپر والی منزل تک جاتا تھا۔ اس اوپر والی منزل میں اشفاق احمد کا اپنا سٹوڈیو تھا۔ ان دنوں وہ پیشنگ بھی کرتا تھا۔ کمرے میں کتابیں، تصویریں کے فریم، رسالے ہر قسم کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ایرل تھا جس پر ایک کیبوس رکھا ہوا تھا۔ اس کیبوس پر ایک آئینہ پیشنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ خریدی آرت تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ بعد میں یہی تصویر ممتاز مفتی کی کتاب ”اسرار انہیں“ کے ٹائٹل پر نظر آئی۔ یعنی ”اسرار انہیں“ کتاب کا سرورق اشفاق احمد نے بنایا تھا۔ جب اشفاق مجھے اچھی بات کی ہوئی پیشنگ دکھا رہا تھا تو مجھے یاد ہے کمرے میں بڑا جس اور گرمی تھی۔ مجھے یہ گرمی اور جس آج تک یاد ہے۔ ہاضی کے دھند لگوں میں ایک روشنی سی چمکتی ہے اور میں اور اشفاق چہرہ مفتی باقر کے ایک تنگ بازار میں جا رہے ہیں۔ اشفاق چہرے پر لگانے والی کریم کی غالی شیشیاں خریدنے میں آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہوں۔ ہم دکان دکان بھر کر شیشیاں دیکھ رہے ہیں۔ اشفاق احمد اندر دکان لاہور کے کلچر پر تبصرہ بھی کر رہا ہے۔ یہاں سے ہم شاہ خانی کی لال مسجد کے پاس نکل آئے ہیں۔ سارا شاہ خانی ٹوٹا ہوا اور چلا ہوا ہے۔ صرف لال مسجد سلامت ہے۔ جگہ جگہ مکانوں کے لمبے کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہیں۔ باغیچوں والے بازار سے لے کر رنگ محل تک لمبہ ہی لمبہ ہے۔ لمبے کے ٹیبلے بنے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے چلنے سے ان ٹیبلوں پر پگ ڈھکیاں بن گئی ہیں۔ ہم دونوں لمبے کی ایک پگ ڈھکی پر چلتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ رنگ محل اور لوہاری منڈی کی طرف مکان سلامت ہیں۔ باقی سارے کا سارا روڈ میدان ہے۔ کہیں کہیں کسی مکان کی

اونچی اونچی دیواریں ابھی تک کھڑی ہیں۔ چھتیں ڈھب چکی ہیں۔ دیواریں ایک طرف کو جھکی ہوئی ہیں۔ ہم فسادات پر ہاتھ کرتے جا رہے ہیں اشتقاقی کہہ رہا ہے۔

”بڑی زبردست آگ لگی ہے یہاں“

میں اسے بتا رہا ہوں کہ بندو بھنڈے نے یہاں بے پناہ اسلحہ اور گولہ بارود جمع کر رکھا تھا۔ اس گولہ بارود کے پھٹنے سے یہاں زیادہ جہازیں نازل ہوئی ہے۔ ہم شہر عالمی دروازہ میں آ گئے ہیں۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ چونکہ میں کسی نے ٹائر جلا کر رکھ دیا تھا جس میں سے گمراہ کالہ سیاہ دھواں اٹھ رہا ہے۔ ہم بائیس واسے بازار میں سے گزر رہے ہیں۔ یہاں کسی دکان کو آگ نہیں لگی۔ شروع میں دونوں جانب ٹھیک کھجوری پٹھانوں، دانت اور بار داسے کی دکانیں ہیں۔ ایک آدمی پوریایں جھاڑ جھاڑ کر ایک طرف لگا رہا ہے۔ گرد اڑ رہا ہے۔ میں گرو سے بچنے کے لئے تیز تیز چلتے لگتا ہوں۔ آگے کھلی دکانوں کے چھوٹے چھوٹے داڑے ہیں جہاں اونچے اونچے خوبصورت ہانسون کی بھریاں دیواروں کے ساتھ لگی ہیں۔ میں ان ہانسون کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ مجھے براہ نکا اور بنگال کے جنگل یاد آ رہے ہیں۔ ان جنگلوں کی تیز ہارشوں میں بچتے ہوئے ہانسون کے جھنڈاؤ آ رہے ہیں۔

ہانسون والے بازار میں کوئی رش نہیں ہے۔ کوئی سکوتر کوئی رکشا نہیں ہے۔ کسی وقت کوئی تاکہ گزر جاتا ہے۔ دائیں جانب ایک راستہ اندر سرائے کے کشادہ میدان کی طرف جاتا ہے۔ سرائے میں لہروں کا اڈہ ہے۔ یہاں سے ہمیں دوسرے شہروں کو جاتی ہیں۔ اس طرف سے کبھی کبھی کسی لاری کی گرڈ گرڈ کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ ہم میوہپتال کے گیٹ میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہماری منزل پاک فی ہاؤس ہے۔ مجھے میوہپتال سے پاک فی ہاؤس کی طرف جانے والا راستہ بہت

پہنہ ہے۔ میوہپتال خاموش خاموش ہے۔ ہم بائیں جانب پکی اینٹوں والے فٹ پاتھ پر چل رہے ہیں۔ یہاں ڈاکٹروں کی وہ منزل رہائش گاہیں ہیں۔ پرانے فیشن کی ٹھنڈے برآمدوں اور آگے کو نکلی ہوئی گیلریوں والی عمارتیں ہیں ان گیلریوں پر کہیں کہیں یوگن ویلا کی سٹیلین چڑھی ہوئی ہیں۔ دورویہ شیل کے درخت دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ سامنے نرسوں کے کواٹر ہیں۔ ایک سفید پوش نرس کواٹر کے باغیچے میں سے لکل کر ہسپتال کی لابی کی طرف جا رہی ہے۔ ہسپتال کے باغیچوں میں پراسنہ ہے۔ کیا دیوں میں پھول مسکرا رہے ہیں۔ ہوا چلتی ہے تو شیل کے پتے ادھر ادھر چلتے ہوئے دھوپ میں ستاروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ ہسپتال کی چھتیں ہوئی ڈیو ڈیو کے سامنے ہرے بھرے پلاٹ کے آگے بڑا ایک بہت عظیم الشان درخت ہے جس کے نیچے چائے کی کیمپن ہے۔ دو چار سٹوڈنٹ سفید کوٹ پہنے گھاس پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ ہم بیڑھیاں اتر کر ٹنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج والی روش پر آ جاتے ہیں جس کی دونوں جانب مرد کے درخت کھڑے ہیں۔ ایک جانب کسی بزرگ کا مزار ہے۔ مزار کے قریب سے گزرتے ہیں تو اگرچیوں کی خوشبو آتی ہے۔ اشتقاقی کہہ رہا ہے۔

”ہمارے قصبے کے باہر بھی کسی بزرگ کا ایک مزار تھا۔“

جسرات کو وہاں بڑی رونق ہوتی تھی۔ مٹی کے چھارخ روشن ہوتے۔ چاروں طرف اگرچیوں کی خوشبو نہیں کہیں بائیں۔“

میڈیکل کالج کے ٹیلا گنبد والے گیٹ کے پہلو میں ایک پلاٹ ہوتا تھا جہاں سارے کے سارے گلاب لگے تھے۔ یہ ولایتی گلاب تھے۔ ان کی بڑی ذکیہ بھال کی جاتی تھی موسم بہار میں رنگ رنگ کے گلاب کھلتے۔ یہاں زرد گلاب بھی تھے۔ اسی باغیچے میں میں نے پہلی بار وہ زرد گلاب دیکھا تھا جس کو دیکھ کر میرے ذہن میں رضیہ کی شکل ابھری تھی

جس پر میں نے اپنا ٹاؤٹ "زور و گلاب" لکھا تھا میں اور اشفاق احمد
ہائیچے میں آکر دیر تک دلائق لکھاؤں کو دیکھتے رہے۔ یہاں سے ہم پاک
ٹی ہاؤس آ گئے۔

پاک ٹی ہاؤس ان دنوں ادیبوں شاعروں کا ٹی ہاؤس تھا۔ ہم لوگ
صبح سے لے کر رات گئے تک یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ہماری
محفلیں گنتی تھیں۔ ٹی ہاؤس میں ہمارے دوست موجود تھے۔ میں اور
اشفاق دیوار کے ساتھ دو آدمیوں والے ٹیبل پر آکر بیٹھ گئے۔ اشفاق
احمد نے مفید فیض اور بکے سواری رنگ کی چٹون پہن رکھی تھی۔ یہ
ہمارا کاموسم تھا۔ ٹی ہاؤس کے چٹھے چل رہے تھے۔ فضا میں چائے، سگار
اور سگریٹوں کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دیوار کے شیشے میں سے لگائی
روشنی ٹی ہاؤس میں آ رہی تھی۔ اشفاق مجھ سے امرتسر کی اور میں اس
کے قصبے اور شہر کی باتیں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سالانہ
جماعت میں تھا کہ کرکٹ کی ایک ٹیم کے ساتھ امرتسر سے فیروز پور شہر گیا
تھا۔ مجھے فیروز پور شہر بڑا صاف ستھرا اور خاموش خاموش شہر لگا تھا۔

"ہماری ٹیم کو ایک اسکول میں ٹھہرایا گیا تھا مجھے یاد ہے چائے
کے ساتھ ہمیں میب دیئے گئے۔ میب لال لال اور چھوٹے
چھوٹے تھے۔"

میں نے ذہنی میں سے کپٹن کامگریٹ نکال کر سلگایا۔ ایک سگریٹ
اشفاق کو بھی دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا۔ وہ سگریٹ کا عادی نہیں
تھا۔ محض فیشن کے طور پر بھی نہیں سگریٹ سلگاتا اور دھواں بہت کم
حلق سے نیچے اُتارتا۔ میں نے اسے کہا۔

"اگر تم دھواں حلق سے نیچے نہیں لے جاتے تو پھر میرا
سگریٹ خالص نہ کرو۔"

وہ ہنسنے لگا۔

"یار یہ شرط نہ لگاؤ۔ میں بھی کبھی کبھار بھی لکھتا ہوں۔"
ہیرا لال چائے لے گیا۔ میں نے چائے پائی۔ ہم چائے پینے
اور باتیں کرتے گئے۔ اشفاق احمد کا سر بڑا شاندار اور ہماری بھڑک تھی۔
اس کے بھورے بھورے بال ماتھے پر لہریں بناتے ہوئے اوپر کو اٹھتے تھے
اور بڑے عجیب تھے۔ ہم دونوں کی بھرپور فوجوانی کی عمر تھی۔ جو کرتے
وہ اچھا لگتا۔ بری سے بری چائے بھی اچھی گنتی تھی۔ نو جوان خون کی
گرمی میں گرم تھے۔ چروں پر چمک تھی۔ بالوں میں چمک تھی۔ ہاتھوں
میں چمک تھی۔ ایک روشنی سی تھی جس کو ہم ساتھ لے کر چلتے تھے۔ جو
ہمارے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

اشفاق چائے کی پیالی پھر پر رکھتے ہوئے بولا۔

"یار! میں گھر جا رہا ہوں۔ شام کو ٹی ہاؤس آؤں گا۔ تم یہاں
ہو گے؟"

وہ چلا گیا۔

یہاں ایک بار پھر ماضی کے آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں۔ پرانی
بادلوں کے سٹیج کا پردہ ایک بار پھر گرتا ہے۔ بادلوں میں دھیمی دھیمی بجلی
چمکتی ہے۔ پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے۔ اس بار منظر کو رنٹ کالج لاہور
— — — — — ضلع ضلع — — — — — پنجاب یونیورسٹی کے پائین باغ کا ہے۔ میں
چھوٹے سے پائین باغ کی روش پر سے ہوتا ہوا اشفاق احمد کی طرف
بڑھتا ہوں۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر پھری طرف بڑھ رہا ہے۔
کتاب اس کے ہاتھ میں ہے۔ سنہری دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ہم دونوں
مکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشفاق احمد کا سرخ و پیید
چہرہ روشنی لگ رہا ہے۔ وہ منکرا رہا ہے۔ اس کے دانت چھوٹے
چھوٹے مگر ہموار اور مفید تھے۔ میں نے اشفاق کی کمر میں ہاتھ ڈال
دیا۔

”کو نوٹن مارکیٹ چلتے ہیں مجھے پائپ کے لئے تمباکو خریدنا“

”ہاں“

میں بھی اکیلا اور کبھی کسی دوست کے ساتھ کسی نہ کسی زمانے نوٹن مارکیٹ کا ایک چکر ضرور لگانا تھا۔ اس کی وجہ نوٹن مارکیٹ کی دو عجیب و غریب صفاتی خصوصیتیں تھیں جو وہاں فضا میں ہر طرف اسی ہوئی ہوتی تھی۔ میں جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں سے لایا گیا ہوا تھا۔ ان ملکوں کی بارشوں کی توازا اور استوائی پھولوں کی گرم خوشبوئیں میرے ساتھ سانس لیتی تھیں۔ جب میں نوٹن مارکیٹ میں داخل ہوتا تو مجھے ایسے لگا کہ جیسے میں رنگوں کی اسکاٹ مارکیٹ اور کولمبو کے ساحل سمندر پر بارش میں بھٹکتے ماربل کے درختوں میں آگیا ہوں۔

اشفاق احمد نے سبزیوں کے مثال پر سے ایک بڑا سا نمائندہ اٹھایا۔ اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے غور سے دیکھ کر بولا۔

”حمید ایسے نمائندہ پور پھاؤنی کی دکانوں پر ہست ہوتے

تھے۔ یہ دلائی نمائندوں کی نسل میں سے ہیں۔ ہمارے کمر

میں ایسی نمائندہ ہوتے تھے جو بڑے دس بھرے ٹازک اور سبز

اور سرخ اور زرد رنگ کے ہوتے تھے۔“

مارکیٹ کی ایک دکان سے ہم نے آئرن مور کے تمباکو کا گول ڈبہ خرید لیا اور ہم اشفاق کے مزنگ روڈ والے مکان کے اوپر والے کمرے میں آ گئے۔ اشفاق احمد اپرل کے پاس برش لے کر کھڑا ہو گیا اور کیڑوں پر پانی ہوئی غیر مکمل آگل پینٹنگ کو غور سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ برش کو کیڑوں کے ساتھ لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور گردن ایک طرف جھکا کر غور سے کیڑوں کو دیکھنے لگا۔ یہ اگلی ایک تجزیاتی تصویر تھی۔ مجھے کچھ رنگ لگے تھے جو مجھے بڑے گندے لگ رہے تھے۔ میں نے کچھ اس قسم کا تجربہ کیا تو اشفاق برش ایک طرف رکھ کر گندے

کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”یہ اسپرٹریٹ آرٹ ہے جینر۔ تم سیدھے سادے رومانوی

رائٹر ہو۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔“

مگر میرا خیال تھا کہ اشفاق احمد بھی اسے نہیں سمجھ رہا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا بنا رہا ہے۔

اس زمانے کے اشفاق احمد کی ایک اور تصویر اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ یادانی رنگ کا گول گھٹے والا کرتا اور رنگین لالچا پینے پاک ٹی ہاؤس میں دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھا ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوں۔ قیوم ظفر شہزاد نقاری اور دوسرے دوست بھی موجود ہیں۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ بڑی گرم جوشی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ اس روز اشفاق لالچا اور کرتا پین کر پاک ٹی ہاؤس آگیا تھا اور ہاتھ کا خود ہر جہت لگ رہا تھا۔ مجھے اس کا اس طرح کے لباس میں وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے اس لباس کے بارے میں اپنے رد عمل کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی مرضی ہے۔ جو چاہے پہن کر آ جائے۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد اشفاق احمد کو میں نے ہاتھ کے جھٹ کے بیروپ میں پاک ٹی ہاؤس میں پھر بھی نہیں دیکھا۔

اشفاق احمد کے ساتھ جو میں نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے اس کی یادیں دھندلی نہیں پڑیں۔ ہاں کہیں کہیں بے سلسلہ ضرور ٹوٹ گیا ہے اور ایسا ہوتا قدرتی بات ہے لیکن جہاں جہاں وہ مجھے یاد ہے اس یاد کی پوری جزئیات میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ ایک طرح نیگیٹو ہیں میری یادوں کے جن کی تصویریں بنا کر میں اس کتاب میں چپا کر رہا ہوں۔ جس طرح آج کل وقت گزر رہا ہے اسی طرح اس زمانے میں بھی وقت گزر رہا تھا۔ مگر ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہمارے لئے وقت

ایک مقام پر آکر رک گیا ہوا تھا۔ یہ مقام فوجوانی کے عروج کا مقام تھا۔ چہرے روشن تھے۔ ماتحتوں پر چاند چمکتے تھے۔ کوئی چہرہ بد صورت نہیں تھا۔ کوئی آواز بے سری نہیں تھی۔ گرمیوں میں اگر درختوں کی چھاؤں میں سکون ملتا تھا تو چلتی ہوئی گرم لو بھی اچھی لگتی تھی۔ مال روڈ اتوار کو خالی خالی ہوتی تھی۔ اشتقاق کے گھر کے آگے جو مزنگ روڈ صفا والا چوک کی طرف جاتی تھی اس پر بھی کھنار ہی کوئی مانگہ گزرتا تھا۔ نہ کوئی رکشا تھا، نہ دیکن، نہ کوئی بس، اس زمانے کی مزنگ روڈ کی ایک فوٹو اشتقاق سے میرے پاس محفوظ رہ گئی ہے۔ اس تصویر میں میرے ساتھ ہمارا مصور دوست انور جلال شمر بھی ہے۔ یہ فوٹو ایک فوٹو گرافر نے ہمارے پیچھے سے اتاری تھی۔ ہم لوگ اس روز اشتقاق سے ملے گئے تھے۔ کچھ دیر اس کے پڑھنی منزل والے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھپتھپاتے رہے۔ انور جلال شمر نے اشتقاق کی جینٹل ڈیکس۔ تجریدی آرٹ پر کچھ بحث ہوئی۔ پھر ہم واپس چل پڑے۔ ہمارے ساتھ ہمارا ایک فوٹو گرافر دوست بھی تھا۔ اس نے بجائے اس کے کہ سامنے سے آکر ہماری تصویر بناتا ہمارے پیچھے چلا گیا اور ہم بازار میں چلے جا رہے تھے کہ اس نے تصویر اتار لی۔ آج میں اس تصویر کو کبھی کبھی صرف مزنگ روڈ کو دیکھنے کے لئے دیکھتا ہوں۔ خالی خالی مزنگ روڈ مجھے کسی اذیتی شریک سزاگ لگتی ہے۔ تصویر میں صرف ایک مانگہ نظر آ رہا ہے۔ باقی ساری مزنگ خالی پڑی ہے۔

ہماری محفلوں زیادہ تر پاک ٹی ہاؤس میں لگتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی ہم کافی ہاؤس میں بھی چلے جاتے تھے۔ میں اس لئے کافی ہاؤس جاتا کہ وہاں انعامیں مہی ہوئی کافی کی خوشبو مجھے جنوب مشرقی ایشیا کی انعاموں میں لے جاتی تھی۔ خاص طور پر مجھے رنگوں، گولہ اور مدراس کے ریستوران یاد آ جاتے جہاں اپنی آوارہ گردی کے دوران میں بیٹھ کر

میں کافی پیا کرتا تھا۔ لاہور کے کافی ہاؤس میں زیادہ تر صفائی وکلا اور سیاست دان ہی بیٹھے تھے۔ شاعروں میں ریاض قادر اور ناصر کاظمی وہاں اکثر دیکھے جاتے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت، ریاض قادر، سردار صادق اور بیٹ کافی ہاؤس کی محفلوں میں سب سے نمایاں نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جس میز پر بیٹھے ہوتے وہاں دوسرے لوگ بھی کرسیاں کھینچ کر آ بیٹھے اور ان لوگوں کی سیاسی، ادبی اور دلچسپ باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے اور ان کی لطیفہ بازیوں سے لطف اندوز ہوتے۔ میں اور اشتقاق احمد دیوار کے ساتھ والی ٹھیل پر جا کر بیٹھ جاتے۔ ہاتھ غا کر لوگوں سے ٹیک سلیک کرتے اور کافی پیچے ہوئے اپنی باتیں کرنے لگتے۔ سبھی ادیب اور شاعر ہمارے دوست تھے۔ ہم سب سے ملتے تھے۔ سب ہم سے ملتے تھے۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے تھے۔ ہماری بڑی بچی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اشتقاق بڑا اچھا لگتا۔ اس کی باتیں بڑی اچھی لگتیں۔ وہ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا تو میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیتا۔ اور ہم خوب مکمل مل کر مزے مزے کی باتیں کرتے۔ اسی زمانے میں اشتقاق احمد نے اپنا مشہور افسانہ بلکہ طویل مختصر افسانہ ”گڈ ریا“ لکھا جس کی چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ میں نے افسانہ پڑھا تو مجھے اشتقاق سے اور زیادہ محبت ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بھی سے لاہور واپس آ چکے تھے اور مسعود پرویز کے ساتھ مل کر ایک پنجابی فلم بنا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اشتقاق احمد کا افسانہ ”گڈ ریا“ پڑھ لیا تھا اور اس سے بڑے متاثر تھے۔ منٹو صاحب کبھی میٹنگز کے ایک قلیٹ میں رہتے تھے۔ ایک بار میں اور اشتقاق احمد ان سے ملے گئے تو منٹو صاحب نے اشتقاق کے افسانے کی تعریف کی۔ اشتقاق جھینپ گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور بولا۔

”وہ تو منٹو صاحب ہیں۔۔۔۔“

منٹو صاحب نے مقامی آنکھوں سے اشتقاق کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہیں کیا۔ اچھا! نمائندہ لکھا ہے تم نے۔۔۔۔“

پھر منٹو صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

”تم کیو اسی ہو۔ کبھی کو دیکھ کر روتا شک ہو جاتے ہو“

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ منٹو صاحب اشتقاق احمد کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس سے میرے دل میں رشک یا حسد کا جذبہ بالکل پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ اشتقاق احمد سے میری محبت کا کمال تھا کہ جو اس سے پیار کرتا تھا مجھے اس سے بھی پیار ہو جاتا تھا۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ خدا نے میرے دل کے سیپ میں محبت کا موتی رکھ دیا ہے۔ کوئی کسی سے محبت کرنا ہے تو میرے دل کا سیپ اپنے آپ کھل جاتا ہے اور اس کے موتی کی روشنی میرے جسم کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

ماہنامہ ”نقوش“ کا اجرا ہو چکا تھا۔ یہ اجرا کا لفظ بڑا مشکل لفظ ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رسالہ ”نقوش“ نکلنے لگا تھا۔ اس رسالے کی اپنی ایک الگ شان تھی۔ طفیل صاحب نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس ادبی رسالے کو بڑا معیاری اور مستند بنا دیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب ’خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور اس کے علمہ ادارت کے روشن ستارے تھے۔ ”نقوش“ کا ناولٹ نمبر نکلا تو اس میں میرا ناولٹ ”جہاں ہر طرف مگر قی ہے“ اور اشتقاق کا ناولٹ ”صمان پیار“ چھپا۔ اشتقاق احمد کا یہ ناولٹ بھی بہت مشہور ہوا۔ اس وقت اشتقاق اپنے فن کے عروج پر تھا۔ اس کا مشاہدہ اور تجزیات نگاری حیرت انگیز تھی۔ اب میں اور اشتقاق ”نقوش“ کے دفتر بھی جاتے ”نقوش“ کا دکان نما دفتر ان دونوں ایک روڈ پر ہوتا تھا۔ پیشے کی الماریوں کے

ساتھ آئے سانسے کرسیاں لگی ہو تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک میر تقی میراں نقوش کے چیف ایڈیٹر اور مالک محمد طفیل بیٹھے تھے۔ طفیل صاحب کو قدرت نے ادب شناسی کے جوہر کے ساتھ ساتھ بڑی ہر ذرا حیرت قسم کی شخصیت بھی عطا کی تھی۔ وہ مختصر مگر بڑی مقول اور نویدی پوائنٹ بات کرتے۔ یہاں وقار عظیم صاحب ’عبادت بریلوی‘ اور احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا ہو میری اور اشتقاق احمد کی بڑی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں رسالہ ”سوریا“ کی جانب سے اس کے مالک اور مدیر عزیز چودھری صاحب نے لارنس بارغ میں ادیبوں کو چاہنے کی دعوت دی۔ ”سوریا“ پر ترقی پسند ادیب کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مگر ان دعوت میں ان ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی جن کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس فی پارٹی کی دو تین تصویریں میرے پاس آئیں بھی۔ محفوظ ہیں ان ادیبوں میں سے بعض ہمارے دوست اور بزرگ ادب کو پیارے ہو چکے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ ان تصویروں میں پہچانے نہیں جاتے۔ اوارہ ”نقوش“ کی جانب سے لارنس میں جو پارٹی ہوئی تھی اس میں منٹو صاحب ’وقار عظیم‘ عبادت بریلوی ’احمد ندیم قاسمی‘ ہاجرہ مسرور ’خدیجہ مستور‘ ظہیر باہر ’شرکت‘ تھاقوی اور دوسرے کئی مشہور ادیب اور شاعر شریک ہوئے۔ اس پارٹی کی مختلف تصویریں ”نقوش“ رسالے میں چھپی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کافی مدت تک میرے پاس محفوظ رہی۔ اس تصویر میں سعادت حسن منٹو کے ساتھ میں اور اشتقاق احمد کھڑے ہیں۔ یہ تصویر فوٹو گرافر نے لارنس بارغ کے اوپن ایئر کیمز کے اس درخت کے نیچے انامری تھی جس کی ایک لمبی شاخ ہمارے اوپر پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے پائپ اپنی بیٹروں کی ٹیبلٹ میں لگایا ہوا ہے۔ میں ان دونوں پائپ پر کرتا تھا۔ پاکستان آ کر ہمارا ادبی سفر شروع ہو چکا تھا۔ میں اور اشتقاق احمد دونوں برابر

افسانے لکھ رہے تھے۔ میں ٹاول اور ٹاولٹ بھی لکھ رہا تھا۔ اشفاق کے دو ماہوں کا مجموعہ "چلے پھول" چھپ گیا تھا۔ یہ کتاب بک لینڈ پبشرز کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ یہ اشاعتی ادارہ راگی ایم سی اسے ہال کی بلائنگ میں مال روڈ کی جانب ایک لمبی دکان میں تھا۔ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "منزل منزل" اور پہلا ٹاول "اوپر سے" شائع ہو گیا تھا۔

راگی ایم سی اسے ہال کی دوسری منزل والے کمرے میں حلقہ ادیبانہ زوق کے ہفتہ وار ادبی اجلاس ہوتے۔ میں اور اشفاق بھی ان جلسوں میں شرکت کرتے۔ کبھی ترقی پسند مصنفین کے ادبی اجلاس میں شریک ہوتے۔ اشفاق احمد نے بانو قدسیہ سے شادی کر لی تھی اور وہ من آباد کے ایک مکان میں رہنے لگا تھا۔ اب وہ نہر ایک مزنگ روڈ والے مکان سے چلا گیا تھا۔ اس کا سن آباد والا پہلا مکان چھوٹی مارکیٹ میں منظر ماڈل سکول کے سامنے تھا اس مکان پر پڑے شیشے لگے تھے اور اسے شیشوں والا کواٹر کہتے تھے۔ یہاں اشفاق نے تھوڑا عرصہ ہی قیام کیا اور دوسرے مکان میں چلا گیا۔ دوسرا مکان بھی من آباد میں گراؤنڈ کے سامنے تھا۔ اب یہ گراؤنڈ ایک باقاعدہ باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اسی زمانے میں انہی یہاں مٹی اڑتی تھی۔ اشفاق کے گھر کے بالکل سامنے گراؤنڈ میں کھجور کے تین درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ میں انہیں تین بہنیں لگا کر لیا تھا۔ میں اکثر اشفاق سے ملنے یہاں جاتا تھا۔ ایک بار میں نے مزنگ میں اپنے ایک راقب کار سے ملنے گیا۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ گرمیوں کی دہر تھی۔ بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ مگر مجھے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ میں تاتے میں سے مزنگ تک لیا تھا۔ جب مجھے میرا واقعہ کار تہ ملا تو میں پیدل ہی من آباد کی طرف چل پڑا۔ آج کل اس سڑک پر پیدل چلنا نکال ہے۔ آدمی رکشوں اور گاڑیوں کے درمیان بھٹکتا جاتا ہے۔ مگر

پاکستان کا شروع شروع کا زمانہ تھا۔ من آباد کے این ٹائپ کواٹروں کی قطاریں ہی ابھی تعمیر ہوئی تھیں۔ نئے مزنگ سے من آباد کی طرف جاتی سڑک خالی خالی تھی۔ ایک طرف قبرستان تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے بوسکی کی قبض کے ساتھ گھرے درخت کی جٹوں اور سرسبز بہن رکھے تھے۔ میں پیدل پہتا سخت گرمی میں اشفاق احمد کے گھر پہنچ گیا۔ یہ این ٹائپ کا مکان تھا۔ میں چھوٹی سی گلی میں سے گزر کر مکان کے عتقی صحن میں گیا۔ بانو قدسیہ باورچی خانے میں چوکی پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ میں اور اشفاق احمد وہاں خانے میں آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں بانو قدسیہ میرے لئے آئس کریم لے آئی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس وقت مجھے آئس کریم کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں سے پیر تک اشفاق کے ساتھ رہا۔ ہم دونوں مکان کے برآمدے میں بیٹھے خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ اب وہ باتیں مجھے یاد نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے سڑک پر ٹالی کے درخت گرمیوں کی گرم سے پھر میں سر جھکائے غامض کھڑے تھے۔

اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ شادی کے بعد مجھے بھی اسی علاقے میں آکر آباد ہونا ہے۔ آج کل میں من آباد میں ہی اپنے مکان میں رہ رہا ہوں۔ میرا یہ مکان اشفاق احمد کے من آباد والے مکان سے قریب ہی ہے۔ صبح میرے کمرے جاتا ہوں تو روزانہ اشفاق کے مکان کے سامنے سے گزرتا ہوں اور مجھے وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ اب یہ گراؤنڈ بڑے اچھے باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ساتھ ساتھ آگے ہوئے کھجور کے تینوں درخت غائب ہو چکے ہیں۔ وہ درخت وہ تین بہنیں مجھے بڑی یاد آتی ہیں۔ ان کی جگہ باغ میں نئے نئے درخت لگ گئے ہیں۔ تقریباً یہ سارے درخت میرے سامنے لگے تھے اور میرے سامنے ہواں ہوئے ہیں۔ اب اب سے میری دوستی ہے۔ ان درختوں میں سنبھل اور

یو کپش کے درخت زیادہ ہیں۔ سنبل کے ایک درخت سے میری اس کے
بچپن کے زمانے سے دوستی ہے۔ اب یہ درخت جوان ہو چکا ہے۔ منہ
اندھیرے چپ میں ستاروں کی دھندلی روشنی میں اس درخت کے پاس آنا
ہوں تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہم خاموش زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ ایک
دوسرے کا حال پوچھتے ہیں اور میں میر کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہوں۔

اب اشفاق احمد نے ایک سائیکل خرید لی تھی۔ وہ سائیکل پر سمن آباد
سے پاک فی ہاؤس اور ریڈیو سٹیشن آتا۔ ہم وہ نول ریڈیو پاکستان لاہور کے
ساتھ بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک ہو چکے تھے۔ میرا مکان ان دنوں فٹنگ روڈ
پر تھا۔ میں لاہور ہو کر والی سڑک پر سے ہوتا ہوا قلعہ سحر سنگھ سے نکل کر
ایبٹ روڈ پر آتا تو یہاں کبھی کبھی اشفاق سے ملاقات ہو جاتی وہ سائیکل پر سوار
ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا ہوتا۔ اگر وہ مجھ سے تھوڑا آگے نکل گیا ہوتا تو
میں اسے ڈانڈ دے کر روک لیتا۔ کبھی وہ مجھے جاتا دیکھ کر میرے پاس آکر
سائیکل سے اتر جاتا اور ہم دونوں باتیں کرتے شملہ پہاڑی کی طرف چل
پڑتے۔ یہاں اب لاہور ٹیلی ویژن سنٹر کی عمارت کھڑی ہے۔ یہاں ان دنوں
ایک ویران سے احاطے میں ایک چھوٹی سی کالنی نما پرانی کوٹھی ہوا کرتی تھی۔
چاروں طرف گدوں کی پانڈ لگی تھی۔ سڑک کی جانب اندر جاتے کیچے راستے
پر ایک تختی لگی تھی جس پر بیکر صاحب کا نام لکھا تھا۔ میں وہ نام بھول گیا
ہوں۔ یہاں کبھی کبھی ایک دو ٹوٹی بھرتی ہوئے والے جوانوں کی چھاتی اور
قر کا ٹاپ لیتے بھی نظر آ جاتے تھے۔ اس احاطے کے ایک کونے میں الماس کا
ایک درخت ہوا کرتا تھا۔ گرمیوں میں ان درختوں پر زرد بھول آتے۔ ان
بھولوں کے زرد فالوس دیکھنے کے لئے میں اور اشفاق قھوڑی دیر کے لئے رک
جالتے تھے۔ پرانا ریڈیو سٹیشن شملہ پہاڑی کے پیچھے پرانے زمانے کی ایک شہ
شکستہ کوٹھی میں تھا۔ اس کے کمرے میں ریڈیو کی کینٹین تھی۔ علم و ادب اور
دنیا کے موسیقی کی بڑی بڑی اہم شخصیتیں اس ٹوٹی ہوئی کرسیوں والی کینٹین

میں بیٹھ کر چائے پیا کرتی تھیں۔

اسی ایبٹ روڈ پر ایک بار میں اکیلا ڈیلیوں کے درختوں کے نیچے سے ہوتا ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ چچے سے آکر اشفاق مائیکس سے اتر گیا اور ہم ہاتھی کرتے چلے گئے۔ اس نے کہا۔

”میں ریڈیو سے ایک سلسلہ وار فیچر شروع کرنے والا ہوں جو ایک ایسے بزرگ کے بارے میں ہو گا جو دوسروں کو بڑی نصیحتیں کرتا ہے مگر خود ان پر کبھی عمل نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا عمل ان نصیحتوں کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔ میں نے اس کا نام ”مقلین شاہ“ سوچا ہے۔ کیا خیال ہے؟“

میں نے اسے جواب دیا تھا۔

”یہ کام تم بہت اچھا کر لو گے کیونکہ تم بھی دوسروں کو بڑی ہدایتیں دیتے رہتے ہو۔“

یہ تو اشفاق احمد کا مزاج ہی ایسا ہے اور یہ پھر وہ واقعی دوسروں کا بھلا چاہتا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ دوسروں کو غلطی کی بڑی تلقین کرتا ہے۔ بڑی کارآمد ہدایتیں دیتا ہے۔ بھرپور جوابی کے دلوں میں بھی میں نے اس کی زبان سے کوئی گالی یا گناہ کی بات شاید ہی کبھی سنی ہو۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ باتیں کرنے میں وہ بڑا ماہر ہے۔ قدرت یہ عطیہ کسی کسی کو عطا کرتی ہے۔ اس زمانے میں بھی اسکا حلقہ اثر وسیع ہو گیا تھا اور وہ ایک آدمی ہر وقت اس کی خدمت کے لئے تیار رہتے تھے۔ ساتی حیثیت سے اشفاق احمد کا کردار شروع ہی سے یہ وارث رہا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس نے نہ تو کبھی کسی کو قرض دیا ہے اور نہ کسی سے قرض لیا ہے۔ ملوکی کی طرح اس نے شرا میں بھی نہیں پل۔ میری طرح اس نے عشق معاشقے بھی نہیں کئے۔ ایسا آدمی ہمارے روایت پرست معاشرے میں ایسا حلقہ اثر پیدا کرنے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اشفاق بھی اس معاملے

میں بڑا کامیاب تھا اور ہے۔ شراب نہ پینے اور عورتوں سے عیش نہ کرنے کو میں کوئی طوطی نہیں سمجھتا۔ اگر آپ اسے غلطی سمجھتے ہیں میری رائے میں اشفاق میں یہ خوبیاں اس لئے پائی جاتی ہیں کہ وہ ”بیبا“ کمزور آدمی ہے۔ اس کے جذبے بھی کمزور ہیں اور اس کا معدیہ بھی شروع سے کمزور رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ میں خوب شراب پیا کرتا تھا۔ ایک ہڈو ہم شملہ پہاڑی کی طرف سے اسمبلی ہال کی طرف آ رہے تھے۔ اشفاق نے بھی نئی گاڑی خریدی تھی۔ ابھی شراب پر پابندی نہیں لگی تھی اور مال روڈ پر انکسپشن دائیں کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اشفاق گاڑی سیدھی چاروا سیمٹا کی طرف نکالے لگا تو میں نے اسے کہا۔

”یہاں سے دائیں جانب گاڑی موڑ لو اور انکسپشن دائیں سے مجھے جم خانے کا کواڑ لے کر دو۔“

اشفاق نے گاڑی دائیں جانب مال پر کرنی اور کہنے لگا۔

”میں گاڑی میں ہی بیٹھ رہا ہوں گا۔ تم جا کر لے آؤ۔“

وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ میں نے گاڑی سے اترنے ہوئے کہا۔

”تمہارے لئے میری برقی لے آؤں؟ مگر یہ بڑی بڑی ہے۔“

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ ”توبہ توبہ۔“

نوجوانی کے زمانے میں بھی اسے گیس کی ٹرل تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہرالا بلا جتنے ہر وقت کھالیتا تھا۔

پراسے ریڈیو سٹیشن کا زمانہ ہماری باری دوستی کا بڑا خوبصورت اور انشائی زمانہ تھا۔ لباس کے بارے میں وہ لاپرواہ رہا ہے۔ مگر اس کی شخصیت میں بڑی کشش ہوا کرتی تھی۔ ہڈ کالج بھی مضبوط تھا۔ خوبصورت بھی تھا۔ بطور المیہ لگا کہ وہ مشہور بھی ہو گیا ہوا تھا۔ مگر لڑکیوں سے محبت کرنے کے معاملے میں وہ بہت پیچھے تھا۔ میں دیکھا کرتا کہ عورتوں کے ساتھ خاص طور پر لڑکیوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ ہوتا تھا۔ یعنی وہی ہدایتیں اور تلقینیں

— ایک لحاظ سے یہ اچھی بات بھی تھی۔ کم از کم وہ عشق کی ایک بہک سے بچ گیا تو۔ کنواری شریف دایوں کی طرح اسے بھی اپنی بدنامی اور تیک نامی کا بہت زیادہ خیال لگا رہتا تھا۔

ایک بار مجھے ایک لڑکی نے کہا کہ اگر مجھ سے ملنا ہے تو رات کے ٹھیک بارہ بجے ہماری کوٹھی کی چابی دیوار پھاند کر آ جاؤ۔ میں نے فوراً کہا۔ آ جاؤں گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اشفاق احمد لیل و نہار کا ایڈیٹر ہوا کرتا تھا۔ میں اس کے دفتر میں بیٹھ کر اس لڑکی سے فون پر باتیں کیا کرتا تھا۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ میں سب رات اس لڑکی کے گھر دیوار پھاند کر جا رہا ہوں۔ اشفاق احمد نے لکھتے لکھتے قلم رکھ دی اور میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیسے اس حرکت سے باز آؤ۔ اگر پکڑے گئے تو جانتے ہو کتنی بے عزتی ہوگی۔ تمہارے سسرال دے لے لیا کہیں گے؟“

میں نے کہا۔

”اس لڑکی نے مجھے چھوچ کیا ہے کہ اگر ملتا ہے تو رات کو دیوار پھاند کر آ جاؤ۔ اب میں پیچھے ہٹا تو یہ میری بے عزتی ہے۔“

اشفاق نے مجھے بڑا سمجھایا۔ اٹھا۔ برا بھلا بھی کہا بڑی بہادری سے۔ مگر میں اپنی جگہ پر قائم رہا۔ میں دن کے دشت جا کر کوٹھی کی دیوار کا جائزہ لے آیا۔ دیوار ڈیڑھ موٹائی تھی۔ اس پر میں صرف کسی دوست کے کانٹوں پر پاؤں رکھ کر ہی چڑھ سکتا تھا۔ اس کام کے لئے میں نے ابنِ انشاء کا انتخاب کیا۔ اس سے بات کی تو وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ دیوار پھاندوں گا۔“

رات کے بارہ بجے تک میں گور ابنِ انشاء مل رہا تھا۔ پھر رات کے بعد ایک گورہ کوٹھی کی طرف گئے اور میں اس کے کانٹوں پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چڑھ گیا۔ ہر حال وہ سسرال دن میں نے اشفاق کو رات کی داستان سنائی تو اس نے ایک بار پھر مجھے ڈانٹا اور

کہا۔

”کانٹوں کو ہاتھ لگاؤ۔ آئندہ یہ حرکت نہیں کرو گے۔“

میں نے اس کے سامنے کانٹوں کو ہاتھ لگا دیا۔

— ابھی میں کمپ کو پرانے ریڈیو سٹیشن کے زمانے کی باتیں ہی سنانا چاہتا ہوں۔ وہ بڑا خوشگوار تھا اور بھرپور جذبول کا زمانہ تھا۔ اشفاق احمد نے ریڈیو پر ”تلقین شاہ“ کی سیر شروع کر دی۔ ایک تو وہ بڑا اچھا ویب تھا۔ دوسرے اس نے ”تلقین شاہ“ کا کردار خود ادا کیا۔ یہ سونے پر سنا کر والی بات ہو گئی۔ پہلے براؤننگسٹ پر ہی ”تلقین شاہ“ مشہور ہو گیا۔ اشفاق نے اپنے پہچانی لیے میں تو اب تک حصار کا لہجہ شامل کر لیا تھا۔ جو لوگوں میں بڑا مقبول ہو گیا۔ ایک بار اشفاق نے مجھے بتایا تھا کہ لوگ اسے روپک حصار کا لہجہ سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ ہوشیار پور کے گروڈ نواح کا لہجہ ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اشفاق احمد جب اس لہجے میں ریڈیو پر بولتے تو ”تلقین شاہ“ کا کردار زندہ ہو کر دہرائی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ اس کا یہ فیچر جرج بھی کبھی کبھار اسلام آباد ریڈیو سے شے میں آ جاتا ہے۔ یہ سچ مجھے اس وقت بھی بہت پسند تھا اور آج بھی میں اسے بڑے شوق سے سنتا ہوں۔ اگر میں لکھ رہا ہوتا ہوں تو کام چھوڑ دیتا ہوں۔ ”تلقین شاہ“ کے علاوہ اشفاق ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھتے۔ مختلف موضوعات پر تقریریں بھی نشر کرتا اور اوب کے میدان میں بھی دو منزلوں پر منزلیں طے کرتا جا رہا تھا۔ اس کی شہرت میں تیز رفتور اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہونا چاہ گیا۔ لیکن اس کے دوستوں کا حلقہ مجھے اور دو ایک اور ادیبوں کو نکال کر زیادہ تر غیر ادبی لوگوں پر مشتمل تھا۔ میرا تو اہمیتا بیٹھا اپنے شاعر اور اوب دوستوں میں تھا جبکہ اشفاق احمد کا اپنا الگ حلقہ پاراں تھا۔ شاعروں ادیبوں سے اس کی ملاقات خاص خاص نشستوں میں ہی ہوتی تھی۔ ظنہ رات شان والے شاعروں اور ادیبوں سے اشفاق بڑا قاطب ہو کر رہا۔ اس زمانے میں ہی اشفاق احمد بڑا چھوک پھونک کر قدم

پاس بیٹھا ہے۔ لڑکی چائے بنا رہی ہے اور وہ کسی بات پر فیس رہا ہے۔ میرے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ کالج کی لڑکیاں 'محضرہ غامین' اور ریڈیو کی آرٹسٹیں وغیرہ اکثر اشفاق کے پاس دیکھی جاتی تھیں۔ اشفاق نے مجھے دیکھا تو اشارے سے بلا لیا۔ میں قریب آیا تو کہنے لگا۔

"آؤ آؤئے کشمیری تم بھی چائے پیو۔"

پھر اس نے لڑکی سے خیراتعارف کرایا۔ اس لڑکی کا نام خالدہ تھا اور وہ لاہور کے ایک کالج میں بی۔ اے یا شاید ایف۔ اے کی سٹوڈنٹ تھی۔ بیٹی شریف سادہ سی لڑکی تھی۔ اس زمانے میں قمری رنگ کے پیڑی کپڑوں کا غورتوں میں بڑا فیشن تھا۔ مگر اس لڑکی کا لباس پیڑی نہیں تھا۔ سر پر دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ وہ سر جھکائے چائے بنا رہی تھی۔ اشفاق نے میرا تعارف کرایا تو لڑکی نے چہرہ اٹھا کر تھوڑی دیر کے لئے میری طرف دیکھا اور دوبارہ چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ چائے اس اہتمام سے بنا رہی تھی جیسے کسی مریض کے لئے نسخے کے مطابق دوا تیار کر رہی ہو۔ میں نے کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور اشفاق سے کسی پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ اشفاق احمد میری باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دے رہا۔ میری بات پر ہوں ہاں کہہ کر وہ اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ لڑکی کے ساتھ اس کا انداز بڑا مریاناہ اور مشفقانہ تھا۔ یہ بھی میرے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ لیکن میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اشفاق احمد لڑکی سے باتیں کرتے کرتے کچھ غوسا سا ہوا جاتا ہے۔ یہ ضرور انوکھی بات تھی۔ کیونکہ میں نے اسے کبھی کسی عورت کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی میں نے کوئی زیادہ خیال نہ کیا۔ لڑکی یعنی خالدہ 'افسانوں' 'افسانہ نگاروں' ریڈیو کے پروگراموں اور دوسری کتابوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ اجازت لے کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اشفاق

رکھنے کا عادی تھا۔ اسے اپنے سوئٹل شیش کا بروقت بڑا خیال رہتا تھا۔ اس کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا سرکاری افسروں کے ساتھ ہو گیا تھا۔ انہیں شاعروں میں بھی ان انہیں شاعروں سے وہ بڑا خوش ہو کر ملتا جو سرکاری افسر تھے۔ اس کی یہ بات مجھے اس لئے بھی اچھی نہیں لگتی تھی کہ وہ مجھ سے دور ہو جاتا تھا۔

ابن انشاء تو پھر بھی ایک بار میرے ساتھ میرا منڈی کی سیر کرنے چل پڑا تھا مگر اشفاق احمد کا تو وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے کبھی میرا منڈی کا ناخن یا یونی سیر کرنے جانے کے لئے کہا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ میرے حساب سے وہ اس ماحول کا آدمی نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اسے زبردستی کبھی میرا منڈی لے جاتا تو میرا منڈی کے ماحول کو سخت تکلیف ہوتی۔ اپنا اپنا ماحول ہوتا ہے۔ اپنی اپنی تکلیف ہوتی ہے۔ جس کو قدرت نے جس ماحول کے لئے پیدا کیا ہے اسے اسی ماحول میں رہنا چاہیے۔

اب میں آپ کو اشفاق احمد کے ایک رومان کی کہانی سناتا ہوں۔ لیکن یہ ایک طرف رومان تھا۔ یعنی لڑکی کو اشفاق احمد سے محبت تھی اشفاق احمد کا اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ پرانے ریڈیو سٹیشن کے زمانے کی بات ہے۔ مجھے یاد نہیں رہا اشفاق احمد کا کوئی افسانہ ادب الحیف یا شاید کراچی کے کسی پرچے میں چھپا اس افسانے کو پڑھ کر ایک لڑکی اشفاق احمد سے محبت کرنے لگی۔ یہ لڑکی لاہور کے ایک کالج کی سٹوڈنٹ تھی۔ میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا۔ کالج کا نام بھی نہیں لکھوں گا۔ آپ اس کا کوئی نام رکھ لیں۔ ہمیں خالدہ رکھ لیتے ہیں۔ اشفاق کو اس قسم کے پرانے نام پسند بھی ہیں۔ ایک دین کی بات ہے۔ میں پرانے ریڈیو سٹیشن پر آیا تو مجھے کسی پروڈیو سر نے بتایا کہ اشفاق صاحب آئے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اسے ریڈیو سٹیشن کے تمام کمروں اور سٹوڈیو میں دیکھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ سٹیشن میں چل کر دیکھنا چاہیے۔ وہاں آیا تو میں نے دور سے دیکھا کہ اشفاق ایک لڑکی کے

احمد نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے اور چائے کا لہجہ گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔

”یار ایہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

”کیوں؟ کوئی خاص بات ہوتی ہے؟“

اشفاق اپنے مخصوص انداز میں غصہ پرانہ کہنے لگا۔

”او نہیں کیسے! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے پتہ ہے ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی“

اشفاق نے موضوع بدل دیا۔ ہم ریڈیو پر دیگر اموں کے بارے میں باتیں

کرتے تھے۔ جاس کے دوستوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے جو ریڈیو

سٹیشن کی کوٹھی کے پہلو میں دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔

خالدہ کا نہ مجھے خیال آیا نہ اشفاق نے اس کا کوئی ذکر کیا۔ ایک دن میں ریڈیو

سٹیشن آیا تو معاملات کے مطابق سیدھا کیمپین کی طرف چل دیا۔ کیونکہ وہاں مجھے

میرے میوزیشن دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی مل جاتا تھا اور میری خواہش

ہوتی تھی کہ ریڈیو سٹیشن پر چائے کی پہلی پیالی کسی شہر کے گیلی کے ساتھ

بیوں۔ اشفاق روز نہیں آتا تھا۔ ورنہ اس کے ساتھ چائے پی کر مجھے بڑی

خوشی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ میرا شروع ہی سے بے تکلف یار بن گیا تھا۔ اور پھر

مجھے وہ بڑا اچھا لگتا تھا۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ مجھے اس سے پیار ہو گیا تھا۔ یہ

پیار آج بھی اسی شدت کے ساتھ قائم ہے اور آج بھی میری خواہش ہوتی ہے

کہ کہیں سے کوئی گاڑی مل جائے تو میں اشفاق کے گھر جاؤں اور اس کے

ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں۔ باتیں کروں۔ اس کی باتیں سنوں اور پھر واپس آ

جاؤں۔ یہ محبت کے معاملات ہیں اور ان معاملات کو صرف بحث کرنے

والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوستیاں کرنے والے نہیں سمجھ سکتے۔ اور میں بنیادی

طور پر محبت کا آدمی ہوں۔ دوستی بھانے کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ بچتے

دوست بناتے سب ایک ایک کر کے میرے دشمن بن گئے۔

میں پھر محبت کی طرف آتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ریڈیو کی

کیٹین میں کونے والی گول میز کے سامنے کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی

ہے۔ میں واپس مڑنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ہفتہ پہلے

اشفاق سے ملنے آئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا کیٹین میں آیا تو دیکھا کہ وہ

خالدہ ہی تھی۔ وہ کتاب پڑھنے میں منہمک تھی۔ میں نے کہا۔

”آپ کو اشفاق صاحب سے ملنا ہے؟“

خالدہ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور سری چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اس نے

مجھے سلام کیا اور پوچھا۔

”کیا اشفاق صاحب آگئے ہیں؟“

میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”وہ تو جتنے میں دو ایک بار آتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر شام کو۔“

نہیں۔ شاید آجائے۔“

میں نے چائے کا آرڈر دیا تو وہ جلدی سے بدلی۔

”جی نہیں شکریہ۔ میں چائے نہیں پیوں گی۔“

”تھوڑی سی پی لیں۔ کوئی بات نہیں۔ شاید اشفاق آجائے۔“

اس نے کتاب بند کر دی اور کیٹین کی پھت کی طرف نگاہیں اٹھا کر

جائزہ لیا اور بدلی۔

”یہ لوگ سناٹا کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟“

میں نے سگریٹ سنگاپا۔ اس دامن میں میں کیپشن سگریٹ پیا کرتا تھا

جو بڑا اچھا سگریٹ ہوتا تھا۔ میں اس بے کالج کی پڑھائی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ

زیادہ تر میری باتوں کا مختصر سا جواب دیتی۔ اس کی نظریں بار بار وہاں سے نظر

آنے والے ریڈیو سٹیشن کے آئینی گیٹ کی طرف اٹھ رہی تھیں جو اگرچہ بند

تھا مگر اس کی سلاخوں میں سے باہر سڑک پر آتے جاتے لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔ بقیہ وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید اشتقاق آجائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے اشتقاق سے کوئی ریڈیو کے بارے میں کام ہے؟ اس نے مکرراتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں۔ ذرا اصل مجھے ان کے ایک افسانے کے بارے میں کچھ معلومات چاہیے تھیں۔“

اس کے احوال سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اصل بات کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے زیادہ کریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چائے آگئی۔ وہ چائے بنا سنے لگی تو میں نے اسے روک دیا اور کہا کہ میں بناتا ہوں۔ کیونکہ میرا تجربہ تھا اور تجربہ ہے کہ ہمارے ہاں کی 95 فی صد خواتین کو چائے پانی نہیں آتی۔ جو پانی فی صد اچھی چائے بناتی ہیں ان سے کہیں سو دو سو سال کے بعد جا کر ملاقات ہوتی ہے۔ ہم چائے پیتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ اشتقاق نہ آیا۔ خالدہ چلی گئی۔ دوسرے روز اشتقاق سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے کہا کہ خالدہ تم سے ملنے آئی تھی۔ وہ غصہ سے

”وہ کیوں آئی تھی؟“

میں نے کہا۔

”وہ تمہارے کسی افسانے کے بارے میں تم سے کوئی بات پوچھنا چاہتی تھی۔“

اشتقاق کے چہرے پر سرقی آگئی۔ وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ اور کہا۔

”جلدی سے مجھے خوش خبری سناؤ کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے۔“

اشتقاق نے ہنسی کے ساتھ لگایا اور بولا۔

”او نہیں یار۔ ہمیں کہاں کسی سے محبت ہو سکتی ہے۔“

”چھ تو پھر خدا کے لئے اس سے ضرور مل لو۔ وہ تم سے ملنے کو سخت بے تاب تھی۔ مجھے تو لگا ہے۔ وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے۔“

اشتقاق میری طرف جھکا دیکھی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

”او نہیں یار۔ تم احمق ہو۔ تم ان بھولی بھالی لڑکیوں کو نہیں جانتے بس انہیں کوئی نہ کوئی سیکرٹس ہو جاتا ہے۔ چلو اوپر چلے میں سناؤ امیر تسری کے پاس۔“

میں نے کہا۔ ”چائے آ رہی ہے۔“

وہ اوپر جانے والے نوپنے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”اسے کچھ اوپر لے آئے۔“

اشتقاق اصرار بھی تک۔ ہمیں آباد والے گھر میں نہیں آیا تھا۔

ایک روز کی بات ہے کہ میں پاک فی ہاؤس میں اپنے شاعر ادیب

دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ کاؤنٹر پر رکھے ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔ عظیم صاحب

نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ تمہارا فون آیا ہے۔ یہ فون خالدہ نے کیا

تھا۔ پہلے تو میں نے اس کی آواز نہ پہچانی۔ جب اس نے بتایا کہ میں خالدہ بول

رہی ہوں تو میں نے پورا سوال یہ کیا کہ خیریت ہے؟ کیلئے گئی۔

”مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”جی نہیں۔“ خالدہ کی فنی سی آواز آئی۔

میں نے کہا۔

”پاک فی ہاؤس آجائے۔ میں اس وقت یہیں بیٹھا ہوں۔“

وہ کہنے لگی۔
 ”نہیں۔ یہاں نہیں۔ آپ ایسے کیوں نہیں کرتے۔ تھوڑی دیر کے
 لئے لارنس بارغ والے اوپن ایئر کیفے میں آجائیں۔ میں بھی کال
 سے وہاں آجاتی ہوں۔“
 میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ پندرہ منٹ بعد پہنچ رہا ہوں۔“

پندرہ منٹ بعد میں لارنس بارغ میں تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ یعنی اپریل
 شروع ہو چکا تھا۔ پھول نکل رہے تھے۔ فضا میں سبزے اور پھولوں کی ملی جلی
 خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ روشنی روشن و صوب چاروں طرف نکلی ہوئی
 تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی گرما بخش تھی جو جسم کو بڑی اچھی لگ رہی تھی اور
 کیپشن کے سگرنے کا براہ و بالا ہو گیا تھا۔ لارنس بارغ کے اوپن ایئر کیفے میں
 ایک میز رنگ کالٹری کا کہیں ہوا کرنا تھا اس کی گھڑی نکلی رہتی تھی۔ خالدہ
 مجھے گھڑی میں سے اندر بھی نظر آئی۔ میں کہیں میں آگیا۔
 خالدہ نے گھڑی کا پہرہ کھول دیا۔

کہنے لگی۔

”میں کالج سے آ رہی ہوں۔ آج دو بجے غلطی تھی۔“
 اس کی دو کتابیں اور ایک کالپ میز پر پڑی تھی۔ میرا آیا۔ میں نے اسے
 چائے کا آرڈر دیا اور موسم کے بارے میں دو تین باتیں کرنے کے بعد پوچھا۔
 ”اب بتاؤ کیا بات ہے؟“

خالدہ کے چہرے پر حیا کی سرخی سی دوڑ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا
 تھا کہ یہ معمہ کیا ہے۔ اتنا ضرور مجھے شک ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی اشفاق کو اچھا
 سمجھتی ہے اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس سے ملنے ریڈیو سنیشن آجاتی ہے۔
 کہنے لگی۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ اشفاق

صاحب تو بڑے معروف گوی ہیں۔ ان سے ملاقات ہی نہیں
 ہوتی۔ فون پر بھی نہیں ملتے۔ آپ ہی مجھے ان کے افسانوں کے
 بارے میں کچھ بتادیں۔ دراصل میں ان پر ایک مضمون لکھنا چاہتی
 ہوں۔“

معمول حل ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ میں نے
 مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”بہابی! وہ بات شمارے دل میں ہے اور جسے تم مجھ سے چھپا رہی
 ہو وہ بتاؤ۔“

خالدہ چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے پر گہری متانت آ گئی۔ میرا چائے رکھ
 کر چلا گیا۔ وہ چائے بنانے لگی تو میں نے اسے روک دیا۔
 ”میں بتاتا ہوں۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“
 وہ کتاب کھول کر اس کے ورق الٹتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔
 ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے
 اشفاق صاحب کے افسانے بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”اور اشفاق صاحب؟“ میں نے بات کٹ کر پوچھا۔ خالدہ منہ دوسری
 طرف کر کے گھڑی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ گھڑی کا پردہ درمیان سے لائی نکلا
 ہوا تھا اور اس میں سے بارغ کے درخت اور تھوڑا سا نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔
 میں نے چائے کی پیالی خالدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”شمارے دل میں جو کچھ ہے وہ مجھے بتا دو۔ اشفاق کو میں بڑی
 اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اگر تم کوگی تو میں اس سے کوئی بات
 نہیں کروں گا۔“

اب جو خالدہ نے میری طرف کر دیا تھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں
 آنسو چمک رہے تھے۔ میں وہیں گم سم سا ہو کر رہ گیا۔ معاملے کی نوعیت کو
 میں بہت کچھ سمجھ چکا تھا مگر معاملہ اتنا آگے بڑھ چکا ہو گا اس کا مجھے گمان تک

نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ کیا کہوں۔ میں یہی کہتا۔

”اگرے! تمہاری آنکھوں میں ’فسو کیوں آ گئے؟“

خالدہ مسکرا دی۔ یہ بڑی اداس بڑی غم زدہ مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگی۔

”اشفاق صاحب مجھ سے فون پر بات کیوں نہیں کرتے؟ میں جب

بھی فون کرتی ہوں وہ یہ کہہ کر فون بند کر دیتے ہیں کہ بی بی بڑے

ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ پھر فون کر لیتا۔“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”تم فون کیوں کرتی ہو؟ ریڈیو سٹیشن آکر فانی بات کر لیا کرو۔“

وہ گہرا سانس بھر کر بولی۔

”آپ کو معلوم نہیں۔ انہوں نے مجھے ریڈیو سٹیشن آنے سے منع

کر دیا ہے۔“

وہ کس لئے میں نے پوچھا۔

خالدہ نے کہا۔

”بس۔ یہ ان کو معلوم ہو گا۔“

میں نے کہا۔

”اچھا تو جو تمہیں معلوم ہے وہ مجھے بتاؤ۔ کیا تم اشفاق سے پیار

کرتے تھی ہو؟“

خالدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سر ہٹکا لیا اور کسی گہری سوچ میں گم

ہو گئی۔ میں نے جب ہنسنے ہوئے اچھا سوال دہرایا تو اس نے لمبی میں سر ہٹاتے

ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔

”یہ اچھی بات ہے۔“

خالدہ نے از خود موضوع بدل دیا اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ میرا برتن

اٹھائے آیا تو میں نے اسے ٹل لانے کو کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ خالدہ مجھ سے

اشفاق کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ اپنے دل کا حال کنٹرول کر

میرے آنکے بیان کرنا چاہتی ہے۔ مگر شرم اور حیا دامن گیر تھی۔ میں نے بھی

اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ہم کبیں سے نکل آئے اور لارنس بارغ کی اس

سڑک پر چلتے گئے جو لارنس روڈ کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ خالدہ نے واپس

کالچ جانا تھا۔ لارنس روڈ والے ٹکٹ پر میں خالدہ سے جدا ہو گیا۔

شام کو پاک فنی پائوس میں اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے

سارا قصہ سنایا۔ وہ پہلے تو بڑا حیران ہوا۔ پھر گردن کو جھٹک کر بولا۔

”بڑی پاک فنی لڑکی ہے۔“

میں نے کہا۔

”وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ

اس کا دل نہ توڑو۔ وہ مجھے بڑی حساس لڑکی لگتی ہے۔ ویسے بھی

محبت کرنے سے تمہارے اندر ایک اچھی تبدیلی آ جائے گی۔ پھر تم

بھی روانہ ہو گئے۔ انہوں نے کہنے لگو مجھے۔“

وہ ہنس رہا تھا۔

”نہیں! ارے! اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا۔ خواہ خواہ بدنامی

ہوگی۔“

میں نے کہا۔

”تم تو بالکل لڑکیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ تمہاری بدنامی کیسے ہوگی؟“

اشفاق نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو! یہ کوئی اور بات کرو۔ یہ تناؤ این انشاء کراچی سے کب آ

رہا ہے۔“

جس بات کا مجھے ذرا خیال تھا وہی بات ہوئی۔ اشتقاق عشق بہت نئے
 صحیحہٹ میں نہیں پڑتا چاہتا تھا۔ یہ بات اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ میں
 نے بھی اس موضوع پر دوبارہ اس سے بات نہ کی۔ کبھی کبھی اسے چھیڑتا ضرور
 تھا۔ وہ اس دیتا تھا۔ خالدہ سے بھی پھر ملاقات نہ ہوئی۔ ایک دن میں نے
 اشتقاق سے پوچھا۔

”خالدہ کا فون تو نہیں آتا؟“

”کنے لگا۔“

”ریڈیو شیخ پر آیا کرتا تھا۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ اب فون
 نہیں آتا۔“

میں نے بڑے انصاف کے ساتھ کہا۔

”تم بڑے عالم ہو اشتقاق! ایک لڑکی تم سے اتفاقاً رقتی ہے اور تم
 اس سے بات تک نہیں کرتے۔“

وہ بولا۔

”ابھائی! جس پنڈ بٹا ہی نہیں پھر اس پنڈ کا راہ کیوں پوچھوں؟ یہ
 کام تم کرو۔ ہاں۔“

وہ میسے گزر گئے۔ اس دوران نہ تو خالدہ نے مجھے پاک ٹی ہاؤس فون کر
 اور نہ ریڈیو شیخ آئی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ میرے ذہن سے بھی وہ تقریباً
 گئی۔ مجھے اپنی محبتوں سے فرصت نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہاں ڈیرہ
 سال گزر گئے ہوں گے کہ ایک روز مجھے پاک ٹی ہاؤس ایک لڑکی نے فون کیا
 اس نے اپنا نام نسreen قایم کہنے لگی۔

”آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں خالدہ کی مرنی سہیلی ہوں۔“

میں نے فوراً پوچھا۔

”اچھا اچھا۔ کیا حال ہے خالدہ کا؟“

دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ میں نے پہلو کیا تو دوسرے

طرف سے اجنبی لڑکی نے کہا۔

”میں فون پر آپ کو کچھ نہیں جاسکتی۔ آپ پلیز مجھے کسی جگہ
 ملیں۔ مجھے آپ سے بڑی ضروری بات کرنی ہے۔“
 میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔
 ”نصرت تو ہے نا؟“

”ہاں آپ مجھے آج ہی کسی وقت ملیں۔ یہ خالدہ کی زندگی اور موت
 کا معاملہ ہے۔“

میں نے فوراً کہہ دیا۔

”میں اور بن ایئر کیفے لارنس ٹیج ابھی آتا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔ یہ
 کیفے دیکھا ہے نا تم نے؟“

”جی ہاں۔ میں آ رہی ہوں۔“

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

○

یہی سوال کر سکتا تھا۔ سرین کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ دہلی چلی
 راتوں لے رنگ کی لڑکی تھی۔ چہرے پر ذہانت کی چمک تھی۔ کہنے لگی۔
 ”خالدہ نے مجھے آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ بتا دیا ہوا ہے۔
 اس لئے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ خالہ نے اپنا برا حال کر لیا
 ہے۔ گھر والے اس کی شادی طے کر چکے ہیں۔ مجرورہ خود کشی کا فیصلہ
 کر چکی ہے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے ڈر لگا تھا کہ کہیں یہ لڑکی مجھے یہ نہ
 بتائے کہ خالہ نے خود کشی کر لی ہے۔ ایسی بات نہیں تھی خالہ نے خود کشی کا
 فیصلہ ہی کیا تھا۔ اور خود کشی کا فیصلہ کرنے والے خود کشی نہیں کیا کرتے۔ خود
 کشی فیصلہ کرنے سے پہلے کی جاتی ہے۔ اور محبت کے معاملے میں جذباتی
 لڑکیاں عام طور پر اس قسم کی باتیں بکارتی کرتی ہیں۔ میں نے سرین سے
 پوچھا۔

”وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہے؟“
 مجھے اس کی وجہ معلوم تھی مگر میں سرین کی زبان بھی مٹنا چاہتا تھا۔
 کہنے لگی۔

”تپ کو تو سب حالات کا علم ہے۔ خالہ اشفاق صاحب سے ہے
 پناہ محبت کرتی ہے۔ یہ روحانی محبت ہے۔“
 ”روحانی محبت؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں! سرین نے کہا۔“ خالہ ویسی کہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں
 نے روحانی طور پر اشفاق صاحب سے شادی کر لی ہوئی ہے۔ اب
 اگر مجرورہ انہوں نے میری کسی دوسری جگہ شادی کر دی تو میں دوسرے کس
 کو مہیاؤں گی۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”زہرا تھی آسمانی سے نہیں ملتا۔“

میں نے بھی دہسور رکھ دیا۔

قد رقی طور پر مجھے پریشانی سی لگ چکی کہ خدا خیر کرے۔ میں اسی وقت لی
 باؤس سے باہر نکلا۔ آٹھ کرایا اور سید حالہ لارنس بلخ جس کا نام آج کل بلخ
 جناح ہے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ ان دونوں مال پر مانگے چلا کرتے تھے۔ دینے بھی
 رش نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ نہ وہ تین نہ دس کٹاؤں سکوت بھی کھار ہی
 کوئی سوز یا زنا آف قسم کی موٹر سائیکل گزرتی تھی۔

میں لارنس بلخ کی سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلا اور پی ایئر کیفے پہنچا۔
 کینے کی کرسیاں تقریباً خالی تھیں۔ میں نے کین کی کڑکی پر نظر ڈالی۔ کین
 بھی خالی تھا۔ سرین ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں نے اس لڑکی کا نام بھی
 فرضی لکھا ہے۔ سرین کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں لان کے کونے والی کرسی پر
 بیٹھ گیا۔ میری نظریں لارنس روڈ والے گیٹ کی طرف لگی تھیں۔ نہ جانے
 کیوں میرا خیال تھا کہ سرین بھی اسی گیٹ کی طرف سے آئے گی۔ مجرورہ مال پٹ
 روڈ والے گیٹ کی طرف سے آئی۔ ایک لڑکی کو میں نے دیکھا کہ اسواری
 رنگ کا برقع پہنے ہاتھ میں کتابیں پکڑے چلی آ رہی ہے۔ اس نے نقاب الٹ
 دیکھا تھا۔ وہ پلاٹ میں سے ہو کر سیدھی میرے پاس آ گئی۔ اس نے میرا نام
 لیا۔

”میں نے نقوش رسالے میں آپ کی تصویر دیکھی تھی۔“

میں اسے لے کر کین میں آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے۔“

نسرین ہوئی۔

”وہ کہتی ہے میں ڈی ڈی ٹی پی لوں گی“

میں نے کہا۔

”وہ پاگل ہے۔ اگر اسے اشتقاق سے مدد ملتی محبت ہے تو پھر خود کشی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ روح تو لطیف ہوتی ہے وہ کسی دوسرے آدمی سے شادی کرنے کے باوجود بھی روحانی طور پر کسی سے اپنی محبت بٹا دے سکتی ہے۔“

نسرین کہنے لگی۔

”خدا کے لئے آپ مجھے کی کوشش کریں۔ میں خالدہ کو جانتی ہوں۔ وہ بڑی حساس لڑکی ہے۔ وہ جو فیصلہ کرتی ہے۔ پھر اس پر عمل کر کے ہی رہتی ہے۔ وہ ضرور خود کشی کر لے گی۔“

میں نے کہا۔

”تو بی بی پھر میں کیا کروں؟ مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

نسرین نے کہا۔

”میں اس لئے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ کو بتاؤں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔“

”ہاں! مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

نسرین کہنے لگی۔

”کسی طرح اشتقاق صاحب کو راضی کریں کہ وہ ایک بار خود خالدہ سے مل کر اسے سمجھائیں وہ نہ میری بات مانتی ہے نہ آپ کی بات مانتی ہے۔ صرف اشتقاق صاحب ہی اسے خود کشی کے فیصلے سے روک سکتے ہیں۔ آپ یقین کریں خالدہ بڑی ضدی لڑکی ہے۔ وہ چار دن سے دے دے گی مگر شادی نہیں کرے گی۔“

میں نے کہا۔

”تم کسی طرح اس کے گھر والوں سے کہہ کر شادی رکوا نہیں سکتیں۔“

”یہ کام میرے بس میں نہیں ہے۔ اور پھر اس کی شادی کا فیصلہ گھر کے بڑے بزرگوں نے کیا ہے اور ہمارے خاندانوں میں شادی کا فیصلہ بزرگ ہی کرتے ہیں۔“

میں خاموش ہو گیا۔ نسرین بھی چپ سی ہو گئی۔ پھر اس نے بڑی رخصت طلب لگا ہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

”میری سہیلی کی زندگی آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ پلیز آپ اشتقاق صاحب سے کہیں کہ وہ خالدہ سے مل کر اسے سمجھائیں۔ وہ ان کی بات ضرور مان جائے گی۔“

میں نے کہا۔

”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ خالدہ کہاں مل سکتی ہے۔“

میں وہاں اشتقاق کو لے کر آ جاؤں گا۔“

میں نے یہ بتایا کہ دوسرے روز دن کے دس بجے نسرین خالدہ کو لے کر پنجاب پبلک لائبریری کے گیتے پر آئے گی۔ وہاں سے ہم لوگ کسی جگہ جا کر بیٹھ جائیں گے۔

”میں وہیں لائبریری میں ہی بیٹھوں گی۔ آپ چاہیں تو اشتقاق صاحب کے ساتھ ہی تنگلو میں شریک ہو جائیں۔ اگر چاہیں تو ان دونوں کو اکٹلا باتیں کر دیں۔ آپ بھی پیڑھے ساتھ لائبریری میں بیٹھ رہیں۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“

میں نے کہا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں ہو جائے گا تم کل پورے دن بیچے دن پنجاب پبلک لائبریری پہنچ جاؤ۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔“

”اور اشتقاق صاحب؟“ نسرین نے پوچھا۔

”وہ میرے ساتھ ہو گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

نہروں کو رخصت کرنے کے بعد میں اشفاق احمد کی تلاش میں نکل نکلا ہوا۔ سڑک روڈ پر اس کے مکان پر گیا وہ وہاں نہیں تھا۔ لی ہاؤس میں بھی نہیں تھا۔ وہاں سے میں آرٹسٹ لون کے سٹوڈنٹ ریڈن روڈ پر آگیا۔ زوبی صاحب نے بتایا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ”یا تھا کہ رہا تھا کہ میں اپنے ایک عزیز سے ملے جا رہا ہوں۔ اہلانا سے میں ریڈیو سٹیشن چلا آیا۔ مجھے ایک تقریر کی ریکارڈنگ کروانی تھی۔ واپس کے بعد ریکارڈنگ سے فارغ ہو کر میں گھر چلا گیا۔“

خام کو پاک فی ہاؤس گیا۔ اشفاق وہاں نہیں تھا۔ میں اس کے گھر گیا۔ وہ مجھے مل گیا۔ میں نے جب اسے سارا قصہ سنایا تو وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایسا کرو تم اسے جا کر سمجھا دو۔ وہ تو احمق لڑکی ہے۔“

میں نے زور دے کر کہا۔

”تمہارا میرے ساتھ جانا بہت ضروری ہے۔ اور اس لڑکی نے کوئی ایسی ویس حرکت کر لی تو اس کا سارا گناہ تمہارے سر پر ہو گا۔“

وہ میرا منہ کھٹکے لگا۔ پھر لٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”میں یار نہیں۔ میں اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میری ماں۔ تم جا کر اس کو سمجھاؤ کہ بی بی اس قسم کی جذباتی باتیں نہیں کیا کرتے۔ ماں باپ جہاں سمجھتے ہیں وہاں شادی کر لو۔ بار مجھے تو اس لڑکی کے ساتھ کوئی محبت وغیرہ نہیں ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

میں نے کہا۔

”تم نے افسانے کیوں لکھے تھے؟ اب اگر تمہارے افسانے پڑھ کر کسی لڑکی کو تم سے محبت ہو گئی ہے تو تمہارا فرض بنتا ہے کہ اگر

اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتے تو کم از کم اس کو بریاد ہونے سے تو بچالو۔“

اشفاق احمد موج میں پڑ گیا۔ ماں کی درخواست کئے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ میں مل لیتا ہوں اس سے کبھی کس وقت جانا ہو گا؟“

”نہروں اسے لے کر کل دس بجے وچانٹ پبلک لائبریری کے گیٹ پر آئے گی۔“

”اور بیٹھیں گے کہاں؟ ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں ہمیں کوئی دیکھ

نہ لے۔“

میں نے اسے بھڑکاتے ہوئے کہا۔

”میں جس۔ اب زیادہ باتیں نہ بھانڈ میں کر لوں گا کسی جگہ کا انتظام۔“

”یار کسی ہوٹل میں نہ رکھنا۔“

”فکر نہ کرو۔“

زرات کو میں اپنے ایک دوست سے جا کر ملا جو وکالت کا امتحان دے رہا

تھا اور اپنے فلیٹ میں اکٹھا رہتا تھا۔ میں اس دوست کا نام بھی نہیں لکھوں گا

اور یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ اس کا فلیٹ لاہور میں کس جگہ واقع تھا۔

بہتر حال دوسرے دن میں اشفاق احمد کو لے کر پہلے اپنے دوست کے

فلیٹ پر گیا۔ چابی میرے پاس تھی۔ فلیٹ کھول کر اشفاق کو وہاں بٹھایا اور کہا۔

”تم یہیں رہنا۔ میں غافلہ کو لے کر آتا ہوں۔“

اس وقت دن کے نماز سے نو بجے تھے۔ وہاں سے میں سیدھا لائبریری

آگیا۔ ابھی دس بجتے میں دس بارہ منٹ باقی تھے۔ میں لائبریری میں جا کر

اٹا بار وغیرہ دیکھنے لگا۔ مگر مجھے بے چینی لگی ہوئی تھی۔ کسی چہرے پر نظر نہیں جم

رہی تھی۔ فوراً باہر نکل آیا اور گیٹ کی لٹیک جانب درخت کی اوٹ میں کھڑا

ہو گیا۔ بار بار گھڑی دیکھتا۔ دس بج گئے دس بج کر دس منٹ ہو گئے۔ نہروں

خالدہ کو لے کر نہ آئی۔ دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ کہیں میرے دوست کے فلیٹ سے اشتقاق ہی نہ بھاگ جائے خدا خدا کر کے مجھے دو لڑکیاں نظر آئیں۔ ایک نے برقعہ پہن رکھا تھا۔ دوسری بغیر برقعے کے تھی۔ برقعے والی نسرین تھی اور اس کے ساتھ والی لڑکی خالدہ تھی۔

قریب آئیں تو میں نے دیکھا کہ خالدہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گئی تھی۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ پرانی لٹاری کلی والے بازار ہے ہمیں تاکہ مل گیا۔ ہم ٹانگے میں سوار ہو گئے۔ تاکہ مختلف بازاروں سے ہوتا ہوا جنرل پر پہنچ گیا۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔ صرف خالدہ سے سرسری الفاظ میں اس کا حال پوچھا جس کا جواب اس نے دھیمی آواز میں ہی ”ٹھیک ہوں“ دیا۔

سارا راستہ دل میں دعاں ملتا رہا کہ اشتقاق فلیٹ پر موجود ہو۔ کہیں وہ فرار نہ ہو گیا ہو۔ خالدہ کی حالت واقعی بڑی خراب تھی۔ اس نے اشتقاق کی روحانی محبت کو دل پر لگا لیا تھا۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دھجک دی۔ اشتقاق نے دروازہ کھولا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں اسے ایک طرف لے گیا۔

”خدا کے لئے لڑکی کی پوری دیکھنی کر۔ تم بڑی اچھی اچھی باتیں کر لیتے ہو اس کو بڑی محبت سے سمجھانا۔ لڑکی غدارانہ ہے۔ اس سے یہی ایک غلطی ہوئی ہے کہ غلط آدمی کو دل دے بیٹھی ہے۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس کو اس طریقے سے ویشل کرنا کہ وہ باقی زندگی آرام اور سکون سے گزار سکے۔ میں اور نسرین لاہوری میں

جا کر بیٹھیں گے۔“

اشتقاق نے جلی زبانہ میں کہا کہ میں وہیں ٹھہروں۔ میں نے نفی میں گردن ہلائی اور نسرین کے قریب آکر بلند آواز میں کہا۔

”چلو بھی نسرین ہم ذرا لاہوری کی عیب دو آئیں۔ مجھے کچھ سنتا میں۔“

نگوانی ہیں اوکے ایڑا لگا ملیں پو۔“

میں اور نسرین کمرے سے نکل آئے۔ مجھے یہ تھا کہ اشتقاق دروازہ بند نہیں کرے گا۔ میں نے پر آدھے میں آکر پلٹ کر دیکھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں داخل گیا۔ اشتقاق سے کہا۔

”بھائی جان اندر سے کنڈی لگا لو۔“

اور دروازہ بند کر دیا۔

وہاں سے میں اور نسرین بیول ہی لاہوری کی طرف چل پڑے۔ اس زمانے میں لاہور پر تھوڑی آبادی والا شہر تھا۔ سڑک پر آج کی طرح ٹریفک کا شور مچا رہا نہیں ہوا تھا۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے بڑے اطمینان سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ نسرین بار بار پوچھتی۔

”اشتقاق صاحب اسے اچھی طرح سمجھائیں گے نا؟“

میں نے کہا۔

”سے سمجھانا ہی تو آتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ بڑی اچھی طرح سمجھائے گا۔“

تقی بعد میں اشتقاق کو کہہ آیا تھا کہ ہم ایک جھگڑے ہو آئیں گے۔ یہ ایک گھنٹہ میں اور نسرین نے لاہوری کی بجائے گلاب گھر کے کونے والے پلاٹ میں گھاس پر بیٹھ کر گزارا۔ اس کے بعد ہم نے ٹانگہ لیا اور واپس فلیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کھن لگا کر سنا۔ اشتقاق احمد کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آہستہ سے دھجک دی۔ اندر سے اشتقاق کی آواز آئی۔

”دروازہ کھلا ہے اندر آ جاؤ۔“

کیسا شریف آدمی ہے اشتقاق احمد۔ میرے کہنے پر اس نے دروازہ کی کنڈی لگا لی تھی۔ مگر میرے جاتے ہی اس نے کنڈی کھول دی

تھی۔ ہوا ایسے آدمی کو کوئی عورت گواہ ترسکتی ہے؟ خدا جانے اس لڑکی خالہ پر کون سا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ میں اور نسرین کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ خالہ کا موڑ بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر پہلے والی پرموگی اور ویرانی غائب تھی۔ اشتقاق جس کر کہنے لگا۔

”لو بھی اسارا۔ خالہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ یہ تو بڑی بھولی بھنی کڑی ہے۔ بھل کر بیٹے اب منکراؤ۔“

خالہ واقعی منکرائے تھی۔ نسرین تو اس سے لپٹ گئی۔ وہ خالہ کی واقعی بڑی جگر کی دوست تھی۔ خالہ کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میں نے بھی مکے کا سانس لیا کہ ایک انجان لڑکی انارٹی عاشق کے ہاتھوں مرے سے بچ گئی۔ فلیٹ سے نکل کر میں نے خالہ اور نسرین کو ایک تاشے پر بٹھایا۔ خالہ نے منکرائے ہوئے مجھے اور اشتقاق کو سلام کیا۔ اس کے بعد ہم بیدل چل پڑے میں نے پہلا سوال اشتقاق سے یہ کیا کہ اس نے خالہ پر کون سا جادو پھونکا ہے۔ اشتقاق دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ہلاتے ہوئے بولا۔

”بس کا کا! اس علم سے ترے خبر ہو“

میں دیں نش پاتھ پر رک گیا۔ اشتقاق کو گھوڑ کر دیکھا تو اس نے فوراً کانوں کو پکڑ لیا اور بولا۔

”خدا گواہ ہے۔ اس بات کا تصور بھی نہ کرنا“

”وہ تو میں نہیں کرنا۔ مگر تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ۔۔۔“

”توبہ توبہ!“

اشتقاق بار بار کانوں کو ہاتھوں سے چھونے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے ضرور اپنا کوئی خاص منتر پھونکا ہے۔ اشتقاق کے پاس بڑے منتر پڑھ۔ ہر موقع کل کے لئے اس کے پاس ایک سے زیادہ منتر موجود ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ پردہ حال منتری ہے۔ میں نے اسے منتر پھونکنے اور پھر اس منتر کا

کامیاب اثر ہوتے دیکھا ہے۔ خالہ کے معاملے میں اس نے اپنا کوئی منتر لکھوا لکھوا دیا تھا۔ منتر پھونکا تھا جو کارگر ثابت ہوا اور خالہ کا ذہن بدل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک سیدھی سادی شریف لڑکی غلام قسم کے ذہنی اختصار اور جذباتی بھون سے نجات پا گئی۔ اس کے بڑے خالہ کافی عرصے تک مجھے کہیں ٹھہرنے آئی۔ کوئی دو برس بعد نسرین سے اتفاقاً ”کسی کلچر کے فنکشن میں ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ خالہ نے اپنے ماں باپ کی مرضی سے شادی کر لی ہے اور اب وہ کراچی میں اپنے خاوند کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی ایک پیاری پیاری بچی بھی ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے یہ خوش خبری اشتقاق کو سنائی تو وہ بھی بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

”چلو! یہ بھی اچھا ہوا۔ خدا اسے خوش رکھے“

اشتقاق احمد کی یہ عادت مجھے شروع ہی سے اچھی لگی تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں بھی وہ بزرگوں کی طرح ہر کسی کی خبر مانگتا۔ ہر کسی کا جھلا چاہتا۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتا۔ میں نے کئی بار اسے کہا کہ جلو ہیرا منڈی چلے ہیں۔ صرف میر کر کے آجائیں گے۔ مگر وہ کبھی میرے ساتھ دبلا نہ گیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بھی کبھی ہیرا منڈی نہیں گیا۔ میں بھی ہیرا منڈی بھرا بننے کے لئے نہیں جایا کرتا تھا۔ بس اپنے کسی دوست کے ساتھ میر کرنے چلا جاتا۔ وہاں کی رونق اور کوشیوں سے آٹی ٹھنکروں کی آواز، گانے کی آوازیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ ریڈیو شیش پر شاہی مجھے کی گانے والیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کے ساتھ اشتقاق بڑے اخلاق سے ملتا۔ اپنی باتوں سے انہیں خوب ہنساتا۔ ان سے شائستگی کی حد تک مذاق بھی کرتا۔ اس سے زیادہ ابن کا کسی گانے والی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

اشتقاق احمد ان دنوں اپنی بھرپور جوانی کے عالم میں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو

ایک وقت دو دو زبان جلا سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایک تو وہ اندر سے کمزور اور شریف آدمی ہے۔ اور پھر ان کے سامنے بڑی جلدی شہا جاتا تھا۔ البتہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی اپنے سے بڑی کٹنی بڑی محرکی خواتین کے ساتھ بڑی جلدی کھل مں جاتا۔ ان کے پاس بیٹھ کر بڑا خوش ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے اشتقاق کو بھی معلوم نہ ہو۔ ریڈیو میٹیشن پر شادی کٹے کی ایک گانے والی آرٹسٹ آیا کرتی تھی۔ میں اس کا نام نہیں لکھوں گا۔ وہ اب زندہ نہیں ہے۔ بڑی خوش گفتار خوش اخلاق اور دل کی بڑی اچھی عورت تھی۔ وہ اشتقاق احمد کو اشتقاق جی کہہ کر مخاطب کیا کرتی۔ شکل صورت کی بھی بڑی اچھی تھی۔ عمر میں وہ اشتقاق احمد سے چھ وہ میں برس بڑی تھی۔ اس کا نام میں لیلیٰ رکھ لیتا ہوں۔ لیلیٰ کا گھر شادی کٹے کی ایک پھوٹی سی گلی میں تھا۔ اسے کتابیں رسالے پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایک دن میں شام کے وقت شاہی محلے کی سیر کر رہا تھا کہ اتفاقاً ایک پان ہالے کی دوکان کے سامنے لیلیٰ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے شاہی محلے میں دیکھ کر بڑی خوش ہو گئی۔ ظاہر ہے اسے خوش ہونا ہی تھا۔ کہنے لگی۔

”یہاں تک آئیے ہو تو اب میرا گھر بھی چل کر دیکھ لو۔“

میں اس کے ساتھ اس کے گھر آ گیا۔ تنگ سی گلی میں مکان تھا۔ مگر اس نے فوراً تنگ دہم بڑا سجا رکھا تھا۔ شبیہ میں اردو کی کتابیں بھی تھیں۔ ان میں نقوش کے رسالے بھی تھے۔ کہنے لگی۔

”اشفاق جی کا افسانہ جس رسالے میں چھپتا ہے میں اسے خرید کر جلد کراچی ہوں اور شہل کر رکھ لیتی ہوں۔“

میں نے دہم میں سوچا کہ یہ بھی ماری بھی۔ مگر فوراً مجھے خیال آ گیا۔ میں جس علاقے میں موجود ہوں اس علاقے کی عورتیں یونہی نہیں مرا کرتی ہیں۔ لیلیٰ سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اشتقاق جی سے محبت کرنے لگی ہو۔“

لیلیٰ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

”یہ کھیل تم لوگوں کے ہیں۔ ہم کوئی اندر کھیل کھیتی ہیں۔ اچھا بٹاؤ۔ تمہارے لئے کیا منگواؤں؟ چائے یا شراب؟“

میں نے کہا۔

”پہلے چائے بگلوؤ۔ پھر شراب۔“

وہ بڑی خوش خوش الماری کی طرف بڑھی۔

”شراب تو تھوڑی بہت یہاں ضرور پڑی ہوگی ہوگی۔“

اس نے الماری کھولی۔ اوپر نیچے ہاتھ مارے اور پھر ایک بوتل نکالی جس میں کچھ شراب باقی بچی ہوئی پڑی تھی۔ بوتل میز پر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”اس میں سے مجھے صرف دو پیگ دے دینا۔ باقی تم اپنی لینا۔ باقی سے پیو گے یا سوڈا واٹر منگواؤں؟ میں تو کاکولا ڈال کر بیٹی ہوں۔“

اس کا کڑوا کڑوا مذاق مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔

یہ عورت جس کا فرضی نام میں نے لیلیٰ رکھا ہے ویسے بھی بڑی صاف گو اور صاف دل کی عورت تھی۔ کبھی منافقت نہیں کرتی تھی۔ جو دل میں ہو گا صاف کہہ دیتی۔ مگر ایک پیگ پینے کے بعد اس کا دل بہت زیادہ کشادہ ہو گیا۔ وہ بات اس کے دل میں شاید کبھی نہ آئی ہو اس نے وہ بھی کہہ دی۔ میں نے جان بوجھ کر اشتقاق کی باتیں شروع کر دیں۔ لیلیٰ کا اردو کا علم بھی دلچسپی سا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر کتابوں کی شبیہ کے پاس گئی اور وہاں سے نقوش کا کوئی نمبر نکال کر لے آئی۔ اس میں اشتقاق احمد کا کوئی افسانہ چھپا ہوا تھا۔ وہ صفحہ نکالا اور اشتقاق کا افسانہ اونچی ”واڑ میں پڑھنے لگی۔ وہ بڑے جوش میں آ گئی تھی۔ ایک پیرا کراٹ ہی پڑھ سکی۔ زمانہ بند کر کے میز پر رکھ دیا اور دوسرے پیگ کا گھنٹ بھر کر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”تم کو کیا معلوم۔ شاہ جی بڑے پیچھے ہوئے بزرگ ہیں۔ اچھی سی عمر

میں ہی انہیں بہت کچھ مل گیا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کون شاہ جی؟"

لیلیٰ نے ہاتھ کو جھپٹتے ہوئے کہا۔

"اپنے تعلقین شاہ جی۔ اشفاق جی۔"

میں نے فوراً لیلیٰ کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنی توجہ یوحنا پر مرکوز کر دی

جس میں بڑی تھوڑی شراب رہ گئی تھی۔ میں نے لیلیٰ کو صاف صاف کہہ دیا۔

"تم اپنے دور ویکسٹ پیٹل کی بیوی ہو۔ اب باقی میری ہے۔"

لیلیٰ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ سگریٹ کی رائیج جھانپتے ہوئے کہنے لگی۔

"فکر کیوں کرتے ہو۔ یہاں جو چاہو گے جس وقت چاہو گے ملے

گا۔"

پھر وہ صوفے پر میرے ہاتھ لگ کر بیٹھ گئی اور بڑی حسرت کے ساتھ

بولی۔

"تم شاہ جی کے "میرا مطلب ہے اشفاق جی کے دوست ہو۔ کبھی

اسے میرے گھر لاؤ۔ تم تین دایکوں میں سے جو کو گے میں پورا کر

دوں گی۔ بس تم مجھے اس کی مریدنی بنا دو۔ میں تمہیں چاندی کا کڑا

پسٹوں گی۔ ماری برادری کی دعوت کروں گی۔"

وہ نہ جانے کیا کیا کچھ بولتی رہی۔ مجھے اس کی صرف آواز ہی آ رہی

تھی۔ پھر آواز بھی کئی تقریباً بند ہو گئی اور میں وہاں سے نکل گیا۔

میں نے اگلے روز اشفاق احمد کو مبارک یاد دہی اور بتایا کہ لیلیٰ اس کی

مریدنی ہو گئی ہے۔

"کیا لیکو اس کو کہہ دو؟" وہ بولا

جب میں نے اسے گلاشتہ رات کا پورا قصہ سنایا تو مجھے پراسیتیں دینے

لگا۔ "یہ بڑی عادتیں ہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔ وہاں مست چلایا کرو۔ میں ان لوگوں

کو برا نہیں کہتا۔ مگر تم وہاں جاؤ گے تو یہ تمہاری برائی ہو گی۔"

میں ہنکراتے ہوئے اشفاق کی پراسیتیں سننا رہا۔ جب وہ خاموش ہو گیا

تو میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"وہی لیلیٰ تم پر مبنی ہے۔ ایک بار میرے ساتھ صرف ایک بار

اس کے گھر چلے چلو۔ تمہیں لکھنے کو بہت کچھ ملے گا۔ میں تو رومان

پرست بندہ ہوں۔ میرا یہ موضوع نہیں ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشفاق لیلیٰ سے کتنا بے لگا۔ پہلے وہ اس کے پاس

بٹھ کر باتیں کر لیا کرتا تھا۔ اب وہ بے حد محتاط ہو گیا۔ دو روز سے لیلیٰ سے سلام

دعا لینا اور اوجھڑا دھر ہو جاتا۔ لیلیٰ بھی عجیب عورت تھی۔ دو روز بعد جب وہ

پروگرام کرنے ویڈیو سنبھل گئی تو وہ اس رات کی اکثر باتیں بھول چکی تھی۔

جب میں نے اسے بتایا کہ اشفاق احمد اسے اپنی مریدنی بنانے پر راضی ہو گیا

ہے تو وہ حیران سی ہو کر بولی۔

"وہ کیوں؟"

میں ٹھٹھک سا گیا۔

"بھئی! تم نے خود ہی تو اس رات کہا تھا کہ مجھے شادی کی مریدنی بنا

رو۔ تمہیں چاندی کا کڑا پسٹوں گی۔"

وہ اور زیادہ حیران ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"میں نے کب کہا تھا؟ کہاں کہا تھا؟"

میں برا خوش ہوا۔ اس عورت کو اسی قسم کے رد عمل کا اظہار کرنا

چاہیے تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اشفاق احمد اردو کا پروفیسر ہو کر اٹلی شادی

سے پہلے کیا تھا یا بعد میں کیا تھا۔ میرا حال وہ اٹلی چلا گیا۔ کچھ عرصہ وہاں کی

یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا رہا۔ اپنی مدت پوری کرنے کے بعد وہ پاکستان واپس آ

گیا۔ وہاں اس کی ایک اعلیٰ ڈاکٹر پروفیسر یوسانی سے بڑی دوستی ہو گئی۔

گلاشتہ برس اس پروفیسر کا اٹالیہ میں انتقال ہو گیا۔ اشفاق نے اٹالیوی زبان

بھی سیکھ لی تھی۔ پاکستان آکر اس نے اٹلی کے بارے میں اپنا افسانہ "رودت الکبریٰ" لکھا جو بڑا خوبصورت افسانہ ہے۔

بانو قدسیہ سے شادی کے بعد اشفاق حسن آباد میں آکر رہنے لگا۔ پہلے پہل وہ پیشوں والی کوغنی میں رہتا تھا جو میرے گھر کے ساتھ والی کوغنی ہے اور اب فی بن گئی ہے۔ اس کے بعد وہ مسجد مخترا والی گراؤنڈ کے سامنے چھوٹی سی کوغنی میں آگیا۔ یہاں میں اس سے ملنے اکثر جا رہتا۔ یہیں پہلی بار میری ملاقات بانو قدسیہ کے بھائی آرٹسٹ پرویز مجھ سے ہوئی جو بڑا اچھا آرٹسٹ اور اس سے بھی اچھا انسان تھا۔ جس کچھ بہرمل عزیز اور دل نواز میں ان دنوں فلمینک روڈ پر رہتا تھا ایک روز اشفاق میرے گھر آیا۔ اس نے کہا کہ اس کا ارادہ ایک منقو قسم کا رسالہ نکالنے کا ہے۔

"یہ اپنی قسم کا لوکھا اور دلچسپ رسالہ ہو گا میرے وارغ میں اس کے لئے بڑے عجب عجیب منصوبے ہیں۔ تم پرچہ دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

اس نے مال روڈ پر جہاں "آفاق" اخبار کا دفتر تھا ایک چھوٹی سی شاہ نشین کرائے پر لے لی۔ رسالے کا نام اس نے "داستان گو" رکھا۔ آفاق والی بلڈنگ کے کچھ حصے ابھی تک چلے ہوئے تھے۔ نشانات کے دنوں میں اس عمارت کو آگ لگا دی گئی تھی۔ "داستان گو" کا دفتر دوسری منزل پر سیزر حیاں چڑھ کر بائیں اٹھ آتا تھا۔ چھوٹا سا لمبا کمرہ تھا۔ پہلو میں ایک ستور روم تھا۔ پرویز نے بڑے آرٹسٹک انداز میں اس کی آرائش کی۔ اشفاق ایک کاؤنٹر ٹراپیڈ کے پیچھے بیٹھا ہوتا۔ ہم دوست انہماک فی ہاؤس سے نکل کر وہاں آ جاتے۔ خوب باتیں ہوتیں۔ شعر و شاعری پر باتیں ہوتیں۔ ریڈیو آرٹسٹ محمد حسین اور آفتاب احمد بھی وہاں اکثر آتے۔ میں ان دنوں "آفاق" اخبار کے ساتھ ساتھ ہسٹک ہو گیا تھا۔ چنانچہ "داستان گو" میں میری اشفاق سے روڑی ملاقات ہوئی۔ "داستان گو" رسالہ پاکستان ماہر کا تھا اور اس میں کچھ بڑی بڑی

ہوتی تھی۔ اس کی لکھائی چھاپائی بڑی معیاری تھی۔ ترکیب و آرائش کی ذمہ داری پرویز کے سپرد تھی جس نے رسالے کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ سرورق بڑے کمال کے ہوتے تھے اشفاق نے اس میں "عبرت کدہ" کے نام سے آپسی واقعات کا ایک سلسلہ شروع کیا جو لوگوں میں بڑا مقبول ہوا۔ اس میں بعض واقعات تو ایسے تھے کہ لوگوں کو اب تک یاد ہیں۔ ان میں کچھ فرضی قصے بھی ہوتے اور سچے واقعات بھی۔ پاک فی ہاؤس سے اٹھ کر اکثر ادیب شاعر یہاں آکر محفل لگاتے۔ چائے کے دور چلتے۔ یہ زمانہ بھی اشفاق کے ساتھ میری دوستی کا روشن اور یادگار زمانہ تھا۔

سعادت حسن منٹو سامنے مال روڈ کے پار کشی سینٹن میں رہائش پذیر تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی "داستان گو" کے دفتر میں آ جاتے۔ محفل کی رونق میں اضافہ ہو جاتا۔ منٹو صاحب اشفاق احمد سے بڑا پیار کرتے۔ منٹو صاحب کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ تقریباً روز ایک افسانہ لکھتے اور کسی اخبار یا رسالے کے دفتر میں جا کر اس کے محض بیس سو فیس روپے وصول کرتے اور ہفتے میں بیس کر سے خانے کی طرف روانہ ہو جاتے۔ دوسرے اخباروں کی طرح روزنامہ "آفاق" بھی اپنا پختہ وار ادبی ایڈیشن نکالتا تھا۔ اس کے لئے بھی منٹو صاحب کبھی کوئی افسانہ لکھ کر لے آتے۔ واپسی پر وہ دوسری منزل میں "داستان گو" کے دفتر میں کمر تھوڑی دیر ضرور بیٹھتے۔ کبھی میں اور اشفاق احمد "داستان گو" کے دفتر سے اٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں چلے جاتے۔ ایک روز ہم گئے تو منٹو صاحب ڈرائنگ روم میں صوفیہ کے کونے میں پاؤں اور اٹھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے والے صوفے پر ایک دہلی تیلی کالے رنگ کی عورت بیٹھی تھی جس نے سارے ہی پہن ہوئی تھی۔ منٹو صاحب موڈ میں تھے اور اس عورت سے مکمل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ عورت شرمیلی رہی تھی اور منٹو صاحب کی باتوں کا موا بھی لے رہی تھی۔ منٹو صاحب نے اشفاق کی طرف دیکھا اور عورت سے کہا۔

”چلو اچھا ہوا اشفاق احمد بھی آگیا ہے۔ اس سے پوچھ لو۔“
ہم دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ اشفاق احمد نے مسکراتے ہوئے
پوچھا۔

”کوئی خاص بات ہے منٹو صاحب؟“
منٹو نے موٹے پیشوں والی عینک کے اوپر سے اشفاق کو اپنی بڑی بڑی
آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور کہا۔

”خاص بات کیا ہوتی ہے خواجہ؟“
پھر منٹو صاحب نے عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”میں نے اس سے شرط لگائی ہے کہ میں تمہارے بریڈیٹر کا سائیز
زبانی بتا سکوں۔ یہ باقی ہی نہیں۔ کیوں خواجہ تم تباہ کیا میں
ٹھیک نہیں کہہ رہا؟“

اب اشفاق احمد کے شرمانے کی باری تھی۔ وہ بھلیں جھانکنے لگا۔ منٹو
صاحب نے کڑک دار آواز میں کہا۔

”ہا خواجہ؟“

اشفاق نے فوراً کہہ دیا۔

”شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں“

”اوسے شاید کیا ہوتا ہے؟“

پھر منٹو صاحب نے دونوں ہاتھوں کو اس طرح اوپر کیا جیسے کسی شے کا
سائز بتا رہے ہوں۔ ہاتھوں کو عورت کی طرف کر کے صوفے سے اٹھے۔
عورت کے قریب گئے تو وہ عورت سے کہہ کر کچھا ہنسا ہو گئی۔ اس کے بعد منٹو
صاحب اپنے خاص انداز میں بیٹھے گئے۔ ان کی ہنسی کی آواز نہیں آیا کرتی
تھی۔

ایک روز میں اشفاق کے پاس اس کے ”داستان کو“ والے دفتر میں آیا
تو وہ سر جھکائے میں بیٹھا کام کر رہا تھا اس روز موسم سرد تھا اور رات کو بگی

بارش بھی ہوتی تھی ماں روڈ پر پینل کے درخت رات کی بارش میں دھلے
ہوئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ ماں روڈ خالی خالی سی تھی۔ ”داستان کو“
کے دفتر میں بھی سردی تھی۔ اشفاق نے چھوٹا سا بکلی کا بیڑا چلایا ہوا تھا مگر اس
کی گرائش صرف میر تک ہی محدود تھی۔ اشفاق نے ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھا
اور بولا۔

”آجائے بیڑے کے پاس بیٹھ جاؤ“

وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں بڑے رومانٹک موڈ میں تھا
اور لارنس بارغ کے درختوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔
”یار کام پھر کر لیا۔ چلو لارنس بارغ چلتے ہیں۔“
اشفاق نے قلم رکھ دی اور مجھے گھورنے لگا۔
”یار کہتے تم ٹھیک ہو۔ چلو لارنس بارغ چلتے ہیں۔“

○

ہم ”داستان گو“ کے دفتر سے اتر کر مال پر آگئے اور فٹ پاتھ پر پھیل کے درختوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے لارنس باغ کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کی بارش کی وجہ سے فٹ پاتھ گیلا لگتا تھا۔ اشفاق نے اپنی ٹھیکہ من اٹلائی گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میرے ساتھ چلتا رہ کوئی ہسپاٹری اور کارنگ رہا تھا۔ فٹ پاتھ نکلی خالی تھا۔ کبھی کبھی کوئی آدمی سامنے سے آکر ہمارے قریب سے ہوتا گزر جاتا۔ مال پر بھی ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہمارے اوپر درختوں کی وحلیں دھلائی شنبلیاں لٹک رہی تھیں۔ ہوا میں نمی اور غلطک تھی۔ ہم پتوں کی جیبوں میں ہاتھ دسے چلے جا رہے تھے۔ اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔ ضرور موسم درختوں اور انسانوں کے ہارے میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ جب ہم چڑیا گھر والے دروازے سے لارنس باغ میں داخل ہونے تو اشفاق نے بائیں جانب گورنمنٹ کالج کے پوٹیشنل چاروٹن کے درختوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”یار ایساں نکال کے درخت لگے ہیں۔ ہر ملک کے درخت دیکھنے کو مل جاتے ہیں“

ابھی چڑیا گھر والوں نے یہ راستہ بند نہیں کیا تھا۔ ہم اس بہت بڑے درخت کے قریب سے گزرے جس کی گنجائش شاخوں میں چوگاڑا لٹے لٹے ہوتے ہیں۔

میں نے اشفاق سے کہا۔

”ہم اوپن ایئر کیفے میں چائے پیئیں گے“

وہ کہنے لگا۔

”اس سردی میں اوپن ایئر میں بیٹھ کر چائے پیو گے تو تمہاری ہڈیاں

جائے گا تمہیں۔“

میں نے کہا۔

”ہم بلیرڈ روم کے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔“

اس وقت جبکہ اوپن ایئر کیفے والوں نے ایک جانب اونچے اونچے درختوں کے سامنے میں کھڑی کا ایک لمبوتر کاٹج بنالیا تھا جس کے اندر بلیرڈ ٹیبل لگے تھے۔ شام کو لوگ یہاں آکر بلیرڈ کھیلا کرتے تھے۔ کاٹج کے آگے کھڑی کے فرش والا ایک جھوٹا سایہ آمہ تھا جس پر بھستہ پڑی تھی۔ میں اور انور جلال شمر بھی اس جگہ آکر بیٹھا کرتے تھے۔

یہ جگہ لارنس باغ کی سب سے دہانٹک جگہ ہے اور مجھے شروع ہی سے بڑی پسند تھی۔ ہم پھاڑی کے دامن میں آکر صوفی سی بجی پگ ڈنڈی پر ہو گئے۔ یہ پگ ڈنڈی مجھے بیٹھ لگا اور برہا کے جنگلوں کی یاد دلاتی ہے۔ پگ ڈنڈی کے دونوں جانب اونچے اونچے کھنے درخت ہیں۔ ان درختوں نے پگ ڈنڈی کو اپنے سامنے میں لے رکھا ہے۔ یہاں دونوں جانب انار امود اور آمود کے درخت ہیں۔ جہاں سے یہ پگ ڈنڈی شروع ہوتی ہے وہاں کسی زمانے میں ساتھ ساتھ آگے ہوئے ایچی کے تین درخت ہوا کرتے تھے۔ اب معلوم نہیں وہ درخت یہاں ہیں یا نہیں۔ مجھے بھی باغ جناح گئے مدت ہو گئی ہے۔ ان درختوں کی مانی بڑی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ جب پھل دیتے کا موسم آتا تو ان درختوں کی شاخیں ایچی کے پتھوں سے جھکی ہوتی تھیں اور ایک مالی قریب ہی بیٹھا ان کی نگرانی کر رہا ہوتا تھا۔ میں نے اشفاق کو وہ درخت دکھائے۔ دسمبر جنوری کا زمانہ تھا۔ درختوں پر پھل نہیں لگا ہوا تھا۔ اشفاق وہاں رک گیا۔ درختوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

”تمہیں معلوم ہے ان درختوں کو کھاد کے طور پر بکرے کا خون بھی

دیا کرتے ہیں۔ ہمارے قصبے کے باہر ایک باغ میں ایچی کے درخت

ہوا کرتے تھے۔ ہم رات کو باغ میں چوری چھپے جا کر اچیاں توڑ کر

لاتے تھے۔“

ہم دسمبر جنوری کی سردی میں پگ ڈنڈی پر سے گزرتے ہوئے بائیں

جانب اوپن ایئر کیف کے لیٹرڈ موم والے برقعے میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں سے باغ کا منظر بڑا دلکش نظر آ رہا تھا۔ سارا منظر سینما سکوپ کی طرح لگ رہا تھا۔ برقعے میں بید کی کرسیوں پر بیٹھے ہم باتیں کرتے گئے۔ اسٹے میں پیرا آ گیا۔ ہم نے چائے کے لئے کما میں نے اٹلی کی باتیں شروع کر دیں۔ اشفاق اطالیہ کی یادوں میں گم ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہاں تھیں بوسانی کے علاوہ بھی کسی ایسی شخصیت سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو تمہیں یاد رہ گئی ہو۔“

اشفاق خاموش تھا۔ جیسے وہ ماضی کے دھندلے اوانوں میں کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ پیرا چائے لگا کر چلا گیا۔ میں چائے بنانے لگا۔ چائے کا ایک گھونٹ پینے کے بعد اشفاق نے مہراساں لیا اور کہنے لگا۔

”ہاں! وہاں ایک عورت مجھے ملی تھی۔ کاش! تم بھی اسے ملے ہوتے۔ وہ دہریہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھی۔ اس کا نام ماریا تھا۔ عام شکل صورت کی عورت تھی۔ عمر تیس بیس کے قریب ہو گی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بڑی خاموش خاموش رہتی تھی۔ کسی سے زیادہ مشکو نہیں کرتی تھی۔ اطالوی عورتیں اور موہ بڑے باتنی ہوتے ہیں۔ بے مکان باتیں کرتے چل جاتے ہیں۔

مگر ماریا ان کے بالکل برعکس تھی۔ بہت کم بولتی تھی۔ چہرے پر ہر وقت ایک اور اسی سی جھلکتی تھی۔ مجھے اس عورت کی ستائش اور سنجیدگی بڑی اچھی لگتی۔ کہنے پیرا میں یا یونیورسٹی کی روش پر کبھی کبھی اس سے ملاقات ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو ویلو ویلو کر لیتے۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ ایک بار میں اس کے مکان پر بھی گیا۔ وہ اپنی ماما کے ساتھ رہتی تھی۔

دونوں عورتوں نے شہر کے ایک متوسط سے علاقے میں پھولا سافلیٹ لے رکھا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ ماریا تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ ماریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے الہم میں مت تصویریں دکھا رہی تھی۔ اس نے الہم بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور دھیمی آواز میں کہا۔ شادی کرنے کو

دل نہیں مانتا۔ وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی ورنہ میں اس سے اس قسم کا ذاتی سوال کبھی نہ کرتا۔ میں نے کہا۔ تمہارا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں ہے۔ کیا بات ہے؟ ہمارے ہاں تو تمہاری عمر کی عورتوں کے بچوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔ ماریا نے اس روز مجھے کوئی قلبی بخش جواب نہ دیا۔

دو تین دن گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت ہم دونوں روم کے ایک قدیم اور بوئے پرسکون رستوران میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ماریا کہنے لگی۔

پروفیسر! تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے آپ تک شادی کیوں نہیں کی۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے شادی اس لئے نہیں کی کہ جس سے مجھے

شادی کرنی تھی وہ تمہارے ملک میں واپس جا چکا ہے۔ تم پنجاب میں رہتے ہو ناں؟ وہ بھی پنجابی تھا۔ اس کا پورا نام صاحب واہ تھا۔ میں اسے صاحب کہا

کرتی تھی۔ پھر ماریا نے مجھے لکڑی کی ایک صندوقچی میں سے ایک تصویر نکال کر دکھائی یہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر ایک فوجی جوان کی تھی جس کے کاندر سے پر

صوبہ اور بھجری جی اور کراؤن لگا ہوا تھا۔ یہ انگریز کے زمانے کی پنجاب رجمنٹ کا صوبہ دار بھجری تھا۔ میں نے ماریا سے کہا۔ یہ تو فوجی جوان ہے۔ تمہیں کہاں

لا تھا؟ ماریا اپنی یادوں میں گم تھی۔ مہاساں لے کر بولی۔ صاحب واہ سے میری پہلی ملاقات فوجی قیدی کیمپ میں ہوئی تھی۔ وہ جنگی قیدی بن کر کیمپ میں اپنی

رجمنٹ کے ساتھ ہی آیا تھا یہ قیدی کیمپ ہمارے پٹانوی گاؤں کے قریب ہی تھا۔ میں روزانہ جیشے پر کپڑے دھوئے فور پانی بھرے جلیا کرتی تھی۔ وہ چپ

ہو گئی۔ پھر صاحب واہ کی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ یہ تصویر صاحب واہ نے مجھے خود دی تھی۔ افسوس! میں اس پر صاحب واہ کے دستخط نہ لے

سکی۔ اس نے کہا تھا میں نے یہ تصویر قادیان میں اتروائی تھی۔“

اشفاق احمد نے اطالوی لڑکی ماریا کی جو ناکام داستان محبت سنائی وہ میں آپ کو اپنی زبان میں سناتا ہوں۔ بوائیوں کہ وہ سری جنگ عظیم میں شمالی افریقہ کے محاذ پر انگریزوں کی انڈین فوج ہرمنوں کے گھیرے میں آ گئی۔

جرمنوں نے انہیں قیدی بنا کر انٹی کے ایک بڑے وسیع و عریض جنگی کیمپ میں منتقل کر دیا۔ ان قیدیوں میں انگریزی فوج کی کسی جناب رجسٹ کے جولن بھی تھے۔ ان میں صوبیدار بجر صاحب داو بھی تھا۔ یہ جنگی قیدی کیمپ ماریا کے گاؤں کے قریب ہی تھا۔ ماریا جہاں چشمے پر کپڑے دھونے جایا کرتی تھی وہاں سے کیمپ کی خاردار تاروں والی دیوار قریب ہی سے گزرتی تھی۔ وہ کپڑے دھوئے ہوئے اکثر قیدی فونیوں کو کیمپ کی گراؤنڈ میں مشقت کرتے "ٹینس" کھوتے "ہال" پر لے لگاتے دیکھا کرتی۔ کسی قیدی کو خار دار باز کے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ماریا چشمے کے پھر پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ کیمپ کے گراؤنڈ میں قیدی فونی فٹ بال کھیل رہے تھے۔ جرمن سپاہی دور کھڑے ان کی گرافٹی کر رہے تھے۔ اچانک کسی نے فٹ بال کو ٹک لگائی تو بال خاردار تاروں والی دیوار کے پاس آکر رک گیا۔ ایک فونی قیدی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے بال اٹھایا اور ماریا کی طرف دیکھا۔ ماریا کہتی ہے کہ میں نے بھی اس قیدی کو دیکھا۔ وہ ماریا کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور فٹ بال اٹھا کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

اب ایسا ہوتا کہ کسی نہ کسی بہانے وہ فونی قیدی کلاٹوں والی دیوار کے پاس آتا۔ ماریا کو ایک نظر دیکھتا۔ مسکرا کر ہاتھ سے سلام کرتا اور تیزی سے واپس چلا جاتا۔ ماریا کو وہ فونی جوان بڑا اچھا لگا۔ پہلے پہل تو ماریا بڑی محتاط رہتی۔ پھر وہ بھی قیدی کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ ایک دن اس نے ہاتھ اٹھا کر قیدی کے سر پر کا جواب بھی دیا۔ بس یہاں سے دونوں میں محبت ہو گئی۔

ایک دن اس قیدی نے جان بوجھ کر فٹ بال کو اس جانب لگ لگائی کہ صبر ماریا فوراً نیچے چمٹے پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ قیدی فٹ بال کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ جب وہ بال اٹھائے لگا تو اس نے کانٹہ کی ایک گولی ماریا کی طرف پھینکی۔ اس سے تھوڑی دور چھوٹوں میں آکر گر گئی۔ قیدی مسکراتا ہوا واپس

بھاگ گیا۔ کیونکہ جرمن سپاہی کسی بھی قیدی کو خار دار تاروں کے پاس نہیں جانے دیتے تھے۔ ماریا نے جلدی سے گیلے ہاتھ پونچھے اور اٹھ کر کانٹہ کی گولی اٹھائی۔ ماریا نے باقاعدہ کالج میں تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اور انگریزی زبان پر اسے عبور حاصل تھا۔ جنگ کی وجہ سے وہ شریچھوڑ کر اپنی ماں کے پاس گاؤں میں آگئی تھی جہاں اس کے باپ کی تھوڑی سی زمینداری تھی۔

ماریا نے کانٹہ کھول کر دیکھا۔ انگریزی میں صرف اٹا لکھا تھا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ماریا کہتی ہے کہ میں شریچھوڑ گئی۔ میرا دل فوراً فوراً سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کانٹہ کو تہہ کر کے اپنی قبض کے اندر چھپا لیا۔ اگلے دن قیدی صاحب دلو دور دور سے ماریا کو دیکھتا رہا۔ کیونکہ دو جرمن سپاہی خاردار تاروں کے پاس چل رہے تھے۔ اور اس روز قیدی فٹ بال بھی نہیں کھیل رہے تھے۔ تیسرے دن ماریا نے بھی ایک کانٹہ پر انگریزی میں "آئی ٹی ٹو" لکھ کر اس کی گولی پٹائی اور قبض کے اندر چھپا کر چشمے پر بیٹھی کپڑے دھوتی رہی۔ وہ بار بار کیمپ کی گراؤنڈ کی طرف دیکھتی۔ صاحب داو اسے کیس نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سارے کپڑے دھو لئے تھے اب وہ انہیں پھوڑ رہی تھی کہ اچانک اس نے صاحب داو کو دیکھا وہ فٹ بال کے ساتھ اکیلا ہی کھیلتا ہوا گراؤنڈ میں ادھر ادھر اچھل کود رہا تھا۔ پھر اس نے فٹ بال کو ٹک لگائی اور اس کے پیچھے دوڑتا ہوا خاردار تاروں کے پاس آگیا۔ اس نے ماریا کو مسکرا کر اشارے سے سلام کیا۔ ماریا نے جلدی سے قبض کے اندر سے کانٹہ کی گولی نکالی اور اس کی طرف اچھا لگی۔ صاحب داو نے ٹپک کر اسے اٹھایا اور فٹ بال کو پاؤں سے تھوکیں ماریا کیمپ کی بارکوں کی طرف چلا گیا۔

اب ان دونوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہفتے میں ایک بار موقع پا کر صاحب داو کانٹہ پر انگریزی میں محبت کا پیغام لکھ کر اس کی گولی بنا کر ماریا کی طرف پھینک جاتا اور دوسرے یا تیسرے دن موقع پا کر کسی بہانے جرمن سپاہیوں کی نظر بچا کر خاردار تار کے پاس آتا اور ماریا کا ہاتھ اٹھا

کر لے جانے ان راتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ ایک دن صاحب واو خدی گولی پھینک کر گیا تو ماریا نے اسے قیض میں چھپا لیا۔ پھر پتھروں کے پیچھے جا کر کھولا تو صاحب واو نے اظہار محبت کے بعد اس سے پوچھا تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ مجھے اس کا نقشہ بنا کر دے۔ کیونکہ میں نے قیدی کیپ سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

پہلے تو ماریا خط پڑھ کر گھبرائی۔ پھر اس نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے محبوب کی ہر طرح سے مدد کرے گی۔ اگلے خط میں اس نے خط میں اپنے گھر کا پتہ بتانے کی بجائے ایک ہاؤس کا نقشہ بنا کر صاحب واو کو اس کا راستہ سمجھایا اور کہا کہ فرار ہونے کے بعد وہ ہاؤس میں آ جائے۔ اس کے بعد وہ اس کی ہر طرح سے حفاظت کرے گی۔ سوشلیوں کا یہ بازار اب ویران ہو گیا ہوا تھا اور بالکل خالی پڑا تھا۔ یہ کیپ سے شمال کی جانب دریا پار ایک ٹوٹی ہوئی بارہ دوری کے عقب میں واقع تھا۔

دو دن بعد صاحب واو نے خط پھینکا جس میں ماریا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے اپنے فرار ہونے کی تاریخ اور وقت لکھے گا۔ اس بات کو دو ہفتے گزر گئے۔ اس دوران صاحب واو دور دور سے ماریا کو دیکھ لیتا۔ دو تاروں کے قریب بالکل نہ آیا۔ وہ ہنسی کے دھچکے کے بعد وہ وقت بال سے کھیلتا نظر آیا۔ ماریا سمجھ گئی کہ آج صاحب واو ضرور خط بھیجے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ایک بار اس نے زور سے فٹ بال کو کنگ لگائی جو لڑھکا ہوا تاروں کے پاس اس جگہ آ گیا جہاں وہ پہری جانب چٹان کی اوٹ میں بیٹھ کر ماریا کو پکڑے دھو رہی تھی۔ صاحب واو دوڑتا ہوا بال کے پیچھے آیا۔ جلدی سے زور ماریا کی طرف پھینکا اور فٹ بال کو لڑھکاتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ ماریا نے جلدی سے رتھ کھول کر پڑھا۔

صاحب واو نے لکھا تھا۔

"میں نے آج رات کیپ سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ شرم نے

جو مجھ بتاتی ہے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں کل شمارا وہاں انتظار کروں گا۔ ضرور آگا۔ پھر ام دونوں یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے اور وہاں جا کر شاوی کر لیں گے۔"

ماریا نے خط پڑھا تو اس کے گل حیا کی لالی سے سرخ ہو گئے۔ وہ رات اس سے سوتے جاگتے بسر کی۔ بار بار خدا سے دعا مانگتی کہ صاحب واو زندہ سلامت کیپ سے نکل جائے۔ جرمن سپاہیوں کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ بڑے سنگ دل ہیں اور ذرا سی بات پر گولی مار دیتے ہیں اور جو قیدی فرار ہو رہا ہو اسے تو وہ بالکل زندہ نہیں چھوڑتے۔ رات گزر گئی۔

اس کے کان کیپ کے سائز کی طرف گئے ہوئے تھے اگر کسی قیدی کے فرار ہونے کا پتہ چل جائے تو کیپ کے سائز چھ اٹھتے ہیں۔ مگر کوئی سائز نہ بچا۔ ماریا بھی سمجھی کہ صاحب واو نے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا کر دیا ہوگا۔ پھر ابھی وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل کر دریا کی طرف روانہ ہو گئی۔ دریا کا پاٹ وہاں بہت چھوٹا تھا۔ یہ پاٹ ہی علاقہ تھا۔ دریا میں جگہ جگہ بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر پڑے تھے۔ ماریا نے ان پتھروں پر پاؤں رکھ کر دریا پار کیا۔ دریا کی وہ سری جانب کچھ فاصلے پر ایک ٹوٹی ہوئی پرانی بارہ دوری تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی وہاں آئی اور پھر لشیب میں اتر گئی۔ اونچے نیچے ٹیلے سحر کی تاریکی میں چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ماریا اس جگہ سے واقف تھی۔ بہت جلد اس نے دور سے سوشلیوں کے ویران ہاؤس کی دھواں چھت دیکھ لی۔

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہاؤس کے قریب آ کر وہ رک گئی۔ ہاؤس کا بیڑہ دروازہ بند تھا۔ وہ پچھلی طرف آگئی جہاں ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ یہ کھڑکی بھی بند تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کر اسے اندر کو دھکیل رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ یہ صاحب واو تھا۔ ماریا کی جان میں جان آئی۔ دونوں محبت کرنے والے ایک دوسرے سے پہلی

باہر میں رہے تھے۔ صاحب داد نے کہا۔

”ابھی تک میرے فرار کا جرموں کو علم نہیں ہوا۔ لیکن دن نکلنے کے بعد جب گراؤنڈ میں کتنی ہوگی تو پھر چل جائے گا پھر جرم سن سکتے لے کر میری تلاش میں نکلیں گے“

ماریا پریشان ہو گئی۔ مگر جلدی اسے ایک خیال آگیا۔ اس نے صاحب

داد سے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ ہم ابھی یہاں سے نکل جاتے ہیں یہاں سے تھوڑے لاصلے پر آرفو کا قہبہ ہے۔ وہاں سے گھنٹے گھنٹے بعد یہیں نیا نو شر کو جاتی ہیں۔ وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ ہم اس کے پاس چلے جائیں گے وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح سو ٹورنڈ لینڈ پہنچا دے گی۔“

صاحب داد نے کہا۔

”میرے کپڑے قیدیوں کے ہیں۔ جلدی سے گھر جاؤ اور میرے لئے دوسرے کپڑے لے آؤ“

ماریا اپنے قدموں گھر کی طرف بھاگی اور اپنے باپ کی ایک پرانی چٹلون اور لمبا گرم دودھ کوٹ لے کر آگئی۔ گھر میں کچھ شرمیں تھیں۔ اس کے باپ ابھی تک سو رہے تھے۔ صاحب داد نے پاڑے میں ہی جلدی جلدی چٹلون پہنی۔ فیض کو الٹا کر کے اوپر نظر لیتا۔ اور کوٹ پہنا اور ماریا کے ساتھ آرفو قہبے کی طرف چل پڑا۔ آرفو قہبے میں پہنچتے پہنچتے سو رنج نکل آیا۔ صاحب داد کہنے لگا۔

”یہاں کوئی بس دیکھائی نہیں دے رہی گنتی شروع ہونے میں آ رہا“

گفتہ رہ گیا ہے“

ماریا نے کہا۔

”ابھی بس آجائے گی۔ تم فکر نہ کرو“

آرفو قہبے کے پرانے اور بوسیدہ مکانوں پر اداسی پھائی ہوئی تھی۔ گمیاں متنبان تھیں۔ لوگ گھروں میں ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے۔ بس شینڈ بھی نکلی تھا۔ ایک کسان بوڑھی عورت بیچ پر خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسے میں دور سے سڑک پر بس آتی نظر آئی۔ ماریا نے اٹالوی کے صاحب داد کو دیکھ اور کہا۔

”میں اپنے پاس رکھو۔ نکلنے میں لوں گی۔ تم خاموش بیٹھے رہنا۔ کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ نہ کسی کی بات کا جواب دینا۔ باقی میں سنبھل لوں گی“

بس آکر رکی تو دونوں بس میں بیٹھ گئے۔ وہاں سے میگانی پہنچے۔ اس وقت دن کے دس بج چکے تھے۔ کیمپ میں قیدی کے فرار کا پتہ چل گیا تھا اور جرمن سپاہی اس پاس کے علاقے میں صاحب داد کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ میگانی میں ماریا صاحب داد کے ساتھ اپنی سہیلی کے گھر ایک ہفتہ رہی۔ یہ کوئی بارونق شر تھا اور قیدی کیمپ سے بہت دور تھا۔ ماریا کی سہیلی نے اپنے ایک قاتل اعزاء دوست کے ساتھ مل کر دونوں کو سو ٹورنڈ لینڈ بھجوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مگر کارروائی بڑی سست رفتار تھی۔ جنگ کا نور بھی بڑھ گیا تھا۔ لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ ایک روز اتحادی طیارے میگانی کے فوجی کیمپ پر بھی بم بھینک گئے۔

صاحب داد زیادہ تر گھر میں ہی چھپا رہتا۔ فوجی کیمپوں پر بمباری کے بعد جرمنوں کی دہلاہٹیں وہاں پہنچ گئیں شرمیں جرمن سپاہی چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ اٹالوی سپاہی بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ماریا نے صاحب داد کو گھر سے باہر نکلنے سے سختی سے منع کر دیا۔ پہلے وہ ہفتے میں دن ایک بار بازار کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ اب وہ سارا سارا دن ماریا کی سہیلی کے گھر کی اوپر والی باہوٹی سی بیٹھک میں ہی پڑا رہتا۔ اس بیٹھک میں گھر کا پرانا ٹونا پھونسا سامان چڑا تھا۔ ایک دن ماریا کچھ چیزیں خریدنے مارکیٹ چلی ہوئی تھی۔ گھر پر اس کی

سمیٹی تھی۔ بیٹھک میں صاحب داد بھی موجود تھا۔ اچانک ایک فوجی ٹرک مکان کے سامنے آکر رکا۔ اس کے اندر سے دس بارہ جرمن سپاہی چلتے گئے۔ باہر کودے اور مارا کی سمیٹی کے مکان کا بندہ دودانہ پوز کر اندر ٹھس گئے۔ اندر جاتے ہی تین فوجی راکٹیں آگے اوپر والی بیٹھک کا قریب بھلا گئے۔ بیٹھک کا بندہ وہ انداز پوز کر اندر آگئے۔

سامنے صاحب داد حیران پریشان کھڑا تھا۔ یہ صاحب داد کو اس وقت انہوں نے قہو میں کر لیا۔ اسے گھٹے ہوئے پیچے لے آئے اور مارا کی سمیٹی کو بھی پکڑ کر باہر لائے۔ دونوں کو ٹرک میں ڈالا اور ٹرک فوجی گھیریں کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ بیماری کا دردانی پیش پانچ منٹ کے اندر اندر ختم ہو چکی۔ محلے کے لوگ باہر آکر سڑاقتراشہ دیکھتے رہے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہاں دشمن کا کوئی جاسوس یا بھانگہ ہوا زید کی چھپا ہوا تھا۔ مارا رہیں آئی تو اس نے دوڑے گھر کے باہر لوگوں کا جھوم دیکھا تو سمجھ گئی کوئی خطرناک بات ہو گئی وہ دوسری طرف سے ہو کر لوگوں کے درمیان آگئی۔ اس نے ایک ذرا وقت عورت سے پوچھا کہ یہاں کیا معاملہ ہے۔ اس نے جرمن سپاہیوں کو برا بھلا کہتے ہوئے بتایا کہ کوئی مفور قیدی تھا جرمن سپاہی اسے اور مکان میں جو عورت رہتی تھی دونوں کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔

مارا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ایک لمحے کے لئے اسے جگہ پہنچ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مگر فوراً ہی رہنمائی گئی۔ وہیں سے لے پاؤں مارکیٹ کی طرف چل پڑی۔ اس کا ذہن جزی سے مدح رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہت جلد وہ اس جتھے پر پہنچ گئی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ یہاں اس کا کوئی بچہ نہ والا بھی نہیں۔ ایک صاحب داد اور اس کی سمیٹی تھی۔ دونوں کو جرمن فوج گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ اب ان کا برا حال دیکھنے والا تھا۔ مارا کا ٹارگٹ جسم خوف کے مارے کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں

میں آنسو آ گئے۔ وہ مارکیٹ میں جانے کی بجائے شہر سے باہر آئی۔ وہ ایک پرانے بلخ میں آکر بیٹھ گئی۔ یہاں بیٹھ کر بہت روٹی بپ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے خوابوں کے عمل دہران ہو گئے تھے۔ اسے بار بار صاحب داد کا خیال آتا۔ جرمن اس کو پکڑ کر وہاں کیمپ میں لے گئے ہوں گے۔ اسے اپنی سمیٹی کا بھی خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے جرمن اس کا کیا حال کریں گے۔

اس دن مارا وہاں اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ شام کو وہ اپنے گھر میں تھی۔ اس نے ساری کہانی اپنے بڑے دادا کو بیان کر دی۔ باپ نے مارا کو بہت ڈانٹا کہ تم ہم سب کو یہاں سے نکلواؤ گی۔ جرمنوں کو پتہ چل گیا کہ تم نے قیدی کی بددیہی تھی تو وہ ہمیں بھی ذمہ نہیں چھوڑیں گے۔ مارا کا باپ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ راتوں رات وہ قصبے والے مکان سے بیوی اور مارا کو بلے کر نکل پڑا اور میلان اپنے چھوٹے بھائی کی دسینداری میں چلا گیا۔

اشفاق احمد کہتے لگا۔

"مارا نے بتایا کہ اس کے بعد صاحب داد سے اس کی بھر بھر ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے دل میں صاحب داد کی محبت کا نقش اتنا گہرا تھا کہ وہ اسے کبھی نہ بھلا سکی۔"

ہماری باتوں میں آسمان پر بات چھا گئے تھے اور بگی بگی بوم بامادی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے میرے کو مزید جانے لاسے کے لئے کہا۔ اشفاق کہنے لگا۔

"نہیں یار۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔ چلتا چاہیے مجھے ابھی بڑا کام کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"مارا کی کہانی سنانے کے بعد بھی تم کو دھیا داری کا خیال آ رہا ہے۔ تم نے اتنی رونا بچک اور اواس کہانی سنا لی ہے کہ میں روم کے شہر

میں ماریا کے پاس پہنچ گیا ہوں۔
اشفاق ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر کرتے ہوئے بولا۔

”یار ماریا مجھے بھی بڑی یاد آتی ہے بڑی سنجیدہ مزاج خاتون تھی۔
یورپ کے ماحول میں صحبت کی اس قسم کی روایات اب کہاں ملتی
ہیں بھلا؟ ماریا ہانکل ہمارے ماحول کی خاتون تھی۔ ویسے بھی انہی
دلوں پر مشرقی روایات کا کافی اثر ہے۔“

میں بارش کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے موتی درختوں کی شاخوں پر سے
پھسل کر گھاس پر گر رہے تھے۔ سردی زیادہ ہو گئی تھی۔ چائے کا دو سرا دوڑ
چلنے لگا۔ چائے فہم ہوئی تو بارش بھی رک گئی۔ اشفاق کندھوں کو جھٹکتا ہوا
اٹھ کھڑا ہوا۔

”بس یار۔ اب میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اب یہاں سے نکل چلو پیچھے
نہ جان کون کون لئے آیا ہو گا۔“

لازنس باغ والے کچے راستے سے ہماری داہنی بڑی روانہ ہو گئی۔
میں تو پیچھے سری لٹکا کے کسی جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ مگر بڑی جلدی میرا
جنگل کا خواب ٹوٹ گیا اور میں چڑیا گھر کے سامنے مال روڈ پر آ گیا تھا جہاں
ایک آٹھ لکھا ٹھک ہا رہا تھا۔

مئی کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ لاہور میں کافی گرمی پڑنے لگی تھی۔ لو
بھی چلا شروع ہو گئی تھی۔ میں اشفاق احمد کے پاس ”واستان گو“ والے دفتر
میں بیٹھا تھا کہ ہمارا ایک خوش باش قسم کا دوست آگیا۔ اس کا نام سکھو تھا۔
آج کل وہ شارجہ میں ایک عرصہ سے مقیم ہے اور وہیں کاروبار کرتا ہے۔
سکھو اب غواڑ آدمی تھا اور ہر وقت میرے چائے کے موڈ میں ہوتا۔ کبھی آتا تو
اتے ہی کہتا چلا یار شیروں چلتے ہیں۔ چلو لازنس کی سیر کر آئیں۔ اس روز وہ
”واستان گو“ کے دفتر میں آیا تو آتے ہی آف آف کرتے لگا۔

”لاہور میں بڑی گرمی پڑ رہی ہے۔ اشفاق صاحب چلیں آپ کو

ایک خوبصورت نہر کی سیر کرو لاؤں۔ خدا کی قسم! پاکستان میں اتنی
خوبصورت نہریں ہیں کہ کیا بتاؤں۔“
اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھائی اکام بست کرنا ہے۔ پرچہ پریس میں جانے والا ہے۔“
سکھو نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”اشفاق صاحب پرچہ پریس میں جاتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت
موقع ہے۔ لو بھی چل رہی ہے۔ گرمی بھی پڑ رہی ہے۔ نیچے گاڑی
بھی کھڑی ہے۔ شیخوپورہ والی نہر تک ہی جانا ہے۔ ایک گھنٹے میں
واپس آ جائیں گے۔“

میں تو تیار ہی تھا خدا جانے اشفاق احمد کیسے تیار ہو گیا کرسی سے اٹھتے
ہوئے بولا۔

”چلو بھائی سکھو رازدرا نہر میں بھی نہا آئیں۔ اپنے قیبے کی نہر میں
نہاے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔“

ہم نیچے آ کر گاڑی میں بیٹھے۔ سکھو گاڑی نکال کر مال پرلے آیا اور
پھر اس کا رخ شیخوپورے کی طرف کر دیا۔ شاید وہ پیچھے تو شیخوپورے والی سڑک
پر ہو گئے۔ شیخوپورے والی سڑک اس زمانے میں بڑی پرسکون سڑک ہوا کرتی
تھی۔ چھوٹی سی سڑک تھی۔ دونوں طرف ٹا بلیوں کے درخت کھڑے تھے۔
بڑی بڑی بھری سرسبز خوشبودار ٹا بلیاں ہوا کرتی تھیں۔ مئی کے دنوں میں ان پر
نور آ جاتا تھا۔ ساری سڑک ان کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ پرندے بھی
سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ابھی یہاں کاروبار نہیں گئے
تھے۔ نفاذ صاف تھی۔ سکھو کافی تیز گاڑی چلا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہم نہر پہنچ
گئے۔ سکھو نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ ہم نہر کے کنارے پرچہ لکھے۔
کنارے سڑک سے اونچے تھے۔ نہر کو دیکھا تو ایک عجیب بغیر آنکھوں کے
سمانے تھا۔ لہالہ بھری ہوئی نہر پرے سکون کے ساتھ بہ رہی تھی۔ دھوپ

میں ان کی سطح شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ پانی کی سطح پر چنے لمبوں کے ساتھ تیرتے چلے جا رہے تھے۔ صرف ان تیروں کی وجہ سے عروس ہو رہا تھا کہ سرسبز رہی ہے۔ اشفاق احمد نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ مجھے یاد ہے اس نے سر کے کنارے پر آتے ہی سر میں دھڑام سے چھانک لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ اس کی شلوار تنک کی طرح پھول گئی۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ میں نے پتلون قمیض پہنی ہوئی تھی۔ دل تو میرا بھی چاہتا تھا کہ سر میں نماؤں۔ کبھی امرتسر کے کپڑے پہنے والی سر میں صبح شام چھلانگیں لگایا کرتا تھا۔ مگر پتلون قمیض کی وجہ سے مجبور تھا۔ مجھے اشفاق پر بڑا رنگ آیا اور وہ مجھے اس وقت بڑا اچھا لگا کہ اس نے مجھے غصے سے بچے بغیر کپڑوں سمیت سر میں چھانک لگا دی تھی۔

کاش! میں بھی ایسا کر سکتا۔ اشفاق احمد تیرتا تیرتا سر کے دوسرے کنارے تک گیا۔ وہاں سے اس نے مجھے آواز دی۔

”صید اماروے چھال۔ آجاتا دی“

میں ہنستا رہا۔ سکندر بھی مسکراتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی سر میں چھانک نہ لگائی۔ ہمارے کپڑوں نے ہم دونوں کو تکرے رکھا۔ پروگرام سکندر کا تھا اور اس کا مڑا اشفاق لے رہا تھا۔ وہ تیرتا ہوا ہمارے کنارے پر آکر باہر نکل آیا۔ اس کے سارے کپڑے کیلے ہو کر اس کے جسم سے چمک رہے تھے۔ ابھی اشفاق نے ڈاڑھی نہیں رکھی تھی۔ مجھے لکھنے ہوئے خیال آتا ہے کہ اگر اس وقت اس کی ڈاڑھی ہوتی تو وہ اسے ہاتھ سے انشور دھماڑا کر رہی ہوتی تھی۔ تو ابھی ہل رہی تھی۔ ہم ٹاہلیوں کے نیچے سر کے کنارے ٹھٹھے ٹھٹھے دھڑکنے لگے۔ اشفاق احمد نے کپڑے تھوڑی دیر میں ہی مڑک گئے۔ اشفاق کہنے لگا۔

”تم لوگ بھی نہالو۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ لاہور سے

کمال باہر نکلتا ہوتا ہے۔“

مگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہالے پر راضی نہ ہوا۔ سکندر نے کہا۔

”اشفاق صاحب! میرا کام تو لوگوں کو تیار کر کے میدان میں لانا ہے۔ آگے ان کا اپنا کام شروع ہو جاتا ہے۔ میں وہاں سے واپس چلا جاتا ہوں۔“

سر کے کنارے ٹاہلیوں کی خوشبو سے منک رہے تھے۔ ٹاہلیوں پر اب بھی سنی کے میٹے میں بور آتا تھا۔ جھونے جھونے زور رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ ان کی خوشبو اڑتی ہے مگر شہزادہ روڈ کی طرف سے آنے والی پٹروں کی بو اور اس کا دھواں اس خوشبو کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ تب ایسا نہیں تھا۔ شہزادہ والی سڑک کی طرف سے بھی ٹاہلیوں کی خوشبو نہیں آتی تھی۔ اس سڑک پر بھی دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت بدلتے سرسبز ہوا کرتے تھے۔ اب یہ درخت ڈیڑھل کے دھومیں سے کالے پڑ رہے ہیں۔

ہم نے کافی وقت سر کے پرسکون خوشبودار ماحول میں گزارا اور پھر سر کو الوداع کہا اور لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اشفاق کہنے لگا۔ ”مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“

مجھے یاد آگیا کہ بچپن میں جب میں سر میں چھلانگیں لگایا کرتا تھا تو مجھے بھی بعد میں بڑی بھوک لگتی تھی۔

امر تہ سے ہجرت کر کے لاہور آنے کے بعد میرا سب سے پہلا ٹھکانہ گوالہڑی میں بنا تھا۔ امر تہ کے ہمارے سبھی جاننے والوں اور رشتہ داروں نے لاہور کے اسی علاقے میں مکانات الاٹ کروائے تھے۔ گوالہڑی کے چوک والے تریستورانوں میں ہماری محفلیں لگتیں۔ رات گئے تک ہم ان چائے خانوں میں بیٹھے امر تہ کے فسادات اور فسادات میں شہید ہونے والوں کی باتیں کرتے۔ جیسے اپنے جو گھر چھوڑ آئے تھے۔ جو گلیاں 'باغ' بازار چھوڑ آئے تھے ان کی باتیں کرتے۔ ان لاشوں کا ذکر کرتے جو ہم نے سڑکوں پر جوئے لائینوں، گلیوں، بازاروں اور نالیوں پر بے گورد کفن پڑی دیکھی تھیں۔ کبھی ساری ساری رات شعر و شاعری اور گانے بجانے میں گزر جاتی۔ گانا بجانا بھی تھا کہ ہمارا ایک دوستی ساتھی تھا جیسے ہونے لایا مرزا صاحبان سنا کہ غریب دہالی دماغ کی کوئی غزل بھیر دیتے۔ اگر ساغر صدیقی شہید ہوٹل کی طرف سے پھرتا پھرتا وہاں آجاتا تو اس سے شعر سنتے۔ ساغر صدیقی انہی پورے کپڑوں میں ہوتا تھا۔ وہ ابھی سیاہ پوش نہیں ہوا تھا۔ جس نے شراب پی پی ہوئی وہ شیوہ کے ڈیرے کی طرف چل دیتا۔ جو جس کا رسیا ہوتا وہ وہیں سگریٹ جتا کر سلگاتا مزے سے گھٹت ہو جاتا۔ ہم میں زیادہ تر چائے کے شوقین تھے۔ رات گئے تک چائے کی پیچکن بھر بھر کرتی رہتیں ہم سب ایک بہت بڑے طوفان سے گزر کر آئے تھے۔ کسی کو اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گا؟ کیا بنے گا؟ سب اسی حال میں مست تھے کہ کہیں میں مل بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ اور رات گزر جاتی ہے۔

ایک روز میں نے اشفاق سے کہا۔
"تم حقیقت پرست ہو۔ اور بڑے اچھے اچھے دلچسپ اور زندہ کردار
اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں
اپنے گوالہڑی کے دوستوں سے ملاتا ہوں۔ تم ان سے مل کر خوش
ہو گے۔"

چنانچہ ایک شام میں اسے لے کر گوالہڑی میں آگیا۔ اس روز میرے
دوستوں کی محفل شیراز ہوئی میں بھی ہوئی تھی۔ میں نے اشفاق کا اپنے
دوستوں سے تعارف کرایا۔ ان میں سے بہت سوں نے اشفاق احمد کی کہانیاں
پڑھ رکھی تھیں۔ وہ اشفاق سے مل کر بڑے خوش ہوئے۔ اس کے لئے ڈبے
کی چائے کا آڈر دیا۔ یہ خاص دودھ پتی والی چائے ہوتی ہے جس کی پیالی میں
اوپر ملائی کی تر بہائی جاتی ہے۔ شہنشاہ کے ہوٹل سے کھنڈ تلے منگوائے کھکے
اشفاق کھنڈ تلے غور سے دیکھنے لگا۔
"یہ خطائیں تو بڑی صحت مند ہیں۔" وہ نے کہا۔
خیابانٹ نے ہنس کر کہا۔
"سرتی ایہ خطائیاں نہیں ہیں۔ یہ امر تہ کی کشمیریوں کی خاص
سوغات ہے انہیں کھنڈ تلے کہتے ہیں۔ یہ تو بے کے ساتھ کھائے
جاتے ہیں۔ لیکن آپ لپٹن چائے کے ساتھ بھی ان کا مزالے
سکتے ہیں۔"

خیابانٹ کو ہم جاوا کہہ کر بلائے تھے وہ کشمیری شالوں کی کڑھائی یعنی
ٹپا اور روتوگری کا بہترین کارگر تھا۔ میں نے اسے اپنے دوست شہنوش بھی
لایا جو گوالہڑی کے چوک میں گریوں میں برف اور مہروں میں پھل بیچتا
تھا۔ بعد میں اس نے چوک میں اپنی دکان خرید لی اور سگریٹ کی بیچنی بھی
بیلے لی۔ شہنوش امر تہ صدیقی کا بہت دوست رہا تھا اور اس نے اپنی دکان میں ساغر
صدیقی کی ایک تصویر شیشے کے فریم میں جڑوا کر لگا رکھی تھی۔ میں نے اشفاق

احمد کو اپنے امرتسری دوست اعظم کے چھوٹے بھائی قاسم سے بھی ملایا۔ قاسم کو بد معاش بننے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے یسٹ لف کے ایک نامی گرامی بزم معاش کی شاگردی اختیار کر رکھی تھی۔ قاسم کی عمر ابھی پھوٹی تھی مگر وہ اپنی جیب میں کمالی وار چاقو رکھتا تھا۔ جسے وہ وقت بے وقت جیب سے نکال کر کھولتا۔ اس چاقو کے کھلنے سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ قاسم نے اشفاق کے سامنے کمالی وار چاقو کھولا تو اشفاق نے پوچھا۔

”ابھی تمہاری اتنی چھوٹی سی عمر ہے اور تم نے اتنا بڑا چاقو اپنے

پاس رکھ لیا ہوا ہے“

قاسم نے اسے بڑے چاقو سے چھوٹا سا امرود کاٹتے ہوئے کہا۔

”اپنا اپنا شوق ہوتا ہے جی“

گوالہنڈی کے چوک میں ہمارا ایک اور مشہور دوست رہا کرتا تھا۔ اس نے جس شہر کو کسری میں مکان لایا، کوہا تھا وہاں آج کل پر تنگ پولیس لگے ہوئے ہیں۔ اس شاعر دوست کے مکان کی کوئی میڑھی نہیں تھی۔ مکان دوسری منزل پر تھا نیچے مٹی کا ٹیلا سا بنا ہوا تھا۔ اس کے مکان پر کوئی مٹے والا آتا تو شاعر اون پر سے رسے کی میڑھی پیچے لٹکا دیتا تھا۔ مہمان جان کا خطہ مولیٰ لے کر درسی کی میڑھی کے دریلے کھڑکی میں سے مکان میں داخل ہوتا۔ ہم اس سے ملنے اس کے مکان پر کبھی نہیں گئے تھے۔ سامنے تعمیر ہو چکا تھا اس کے بچے کپ شپ کر لیتے تھے ہمارے اس شاعر دوست میں یہ بات بڑی اچھی تھی کہ وہ بیخوش دوسروں کے شہر بناتا تھا۔ اپنے شہر صرف شمالی میں لگتا کرتا تھا۔

گوالہنڈی کے شیراز ہو چل میں ہی میں نے اشفاق کو تو عمر سبے بابک مگر کمال جھلی میریت سے بھی ملایا۔ اگر میں بھولا نہیں ہوں تو اس کا نیم یا جملیں حضرت ہی تھا۔ دہلا پٹا سو کھانا کھانا جو ان لوگ تھا۔ اسے لی لی کا مرض ہو

تھا۔ اپنے مجید صی بابک والے گھر پر ہی خبریں بتاتے۔ ان کی کتابیں کرتا اور ان کے اخباروں کے دفتروں میں جا کر خود ہی دے آتا۔ مجید صی بابک میں ایک شہر کوہ لڈنگ میں اخبار ”سفید“ کا دفتر ہوتا تھا۔ اس اخبار کے مدیر و قارئین انہاوی تھے۔ اشفاق احمد جس روز میرے ساتھ گوالہنڈی میں آتا ہم وہ قارئین صاحب سے ملاقات کرتے ان کے دفتر بھی جاتے۔ میرے گوالہنڈی کے امرتسری دوستوں میں ایک بھرجی بھی تھا۔ وہ کوئی رنگ نہیں تھا۔ ہماری عمر کا بوجھ ان ہی تھا۔ مگر سب اسے بھرجی بھرجی کہتے تھے۔ بھرجی نے کوئی امتحان پاس نہیں کیا تھا۔ مگر وہ بڑا فکریے بارے میں تمام نونی نکات کا ماہر تھا۔ کوئی شخص جرم کر کے اس کے پاس آتا تو بھرجی اسے پینے ایسے کہتے جاتا کہ مجرم بھی حیران رہ جاتا۔ اور اکثر اوقات شانت پر رہا ہی ہو جاتا۔

گوالہنڈی میں ہمارے ایک دوست کی شادی تھی۔ اس نے اشفاق کو

ی دعوت نامہ دیا اور کہا۔

”سزجی آپ بھی ضرور آئیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“

اشفاق احمد نے کہا۔

”میں ضرور آؤں گا۔ عید کے ساتھ ہی آؤں گا۔“

میں اشفاق کو شادی سے ایک رات پہلے بھی وہاں ملے تھا۔ ہمارے

دوست نے موسیقی کی محفل سجائی تھی مکان کے صحن میں دریاں سجی تھیں۔

ڈانڈے لگے تھے ہمارے عیب دوست بیٹھے ایک دوسرے سے مس نہیں کر

پاتی کر رہے تھے۔ کہیں شعر و شاعری پر باتیں ہو رہی تھیں گانے والوں میں

زور دیا جاتا اور ڈیر ٹیلر ماسٹر پیش پیش تھے۔ ہمارا دوست امرتسری کشمیری تھا۔

میں نے خاص طور پر سماگ بھی کی دیکھ چکا تھا۔ پہلے سبز کشمیری چائے کا

ور چلائے ساتھ باقر خانیاں بھی تھیں۔ وہ بچے رات کو دیکھ کا منہ منہ کیا

ور سب نے منہ سے لے کر سفید چاروں کے ساتھ سماگ بھی کھائی۔ پھر

جائے آئی۔ چائے کے بعد شعری دکن سے پان کے قبال آگئے۔ سگریٹ
سلاگلے گئے اور سب سے پہلے نذیر نیلر باسٹرنے گھڑے پر ماہیا خایا۔ پھر
سامعین کی فرمائش پر دغابی ظلموں کے دو گیت سنائے جو اس زمانے میں بڑے
مقبول تھے۔ مثلاً

سوئے چوڑے والے

نی اک واری آجا

ساروں بکھرا دیکھا جا

اس کے بعد نذیر ربانی نے اپنی شریلی آواز میں اسماعیلہ کا کلام سنانا
شروع کیا۔ نذیر ربانی نے کاری اور نثر کا بادشاہ تھا۔ رات بھر یہ مفضل جاری
رہی۔ رات کے کوئی تین بجے اشتقاق نے میری طرف جھپک کر کہا۔

”یار! اب چلنا چاہیے۔ جی دیو ہو گئی ہے۔“

میں نے کہا۔

”اب جا کر کیا کرو گے۔ رات تو گزری گئی ہے۔ صبح ہریے اور
قلعے کا شیشہ کر کے چلے جانا۔“

مگر اشتقاق احمد نہ رک۔ میں اسے کسی ہمارے محفل سے اٹھا کر باہر بازار
میں لے آیا۔ خوشی بہار کا موسم تھا۔ پچھلے پیر کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی
تھی۔ تیسریوں کے چوک سے ہمیں ایک غلابی تاکہ مل گیا۔ اشتقاق کو رخصت
کر کے میں زندہ دلاں امرتسر کی محفل میں واپس آیا تو ضیاء بیٹ نے دور سے
بلند آواز میں پوچھا۔

”اشتقاق صاحب چلے گئے کیا؟“

میں نے کہا۔

”ہاں یار! انیس صبح جلدی اٹھا تھا۔“

نذیر نیلر باسٹرنے کہا۔

”اب اٹھنے کی ضرورت ہی نہاں تھی۔“

دوسرے دن ہارات تھی۔ اشتقاق بھی ہارات میں میرے ساتھ تھا۔
دولہا کی طرف سے کشمیری باسے کا خاص طور پر احترام کیا گیا تھا۔ ابھی لاہور
میں امرتسر کے کشمیری بیڑ والے موجود تھے اور کشمیریوں کی ہارات میں انہیں
ضرور بلایا جاتا تھا۔ ہارات کو گوا ملٹی سے نسبت دو تک ہی بلاتا تھا۔ مگر اس
نے بیسے ڈاک خانے کی طرف سے ہو کر ساری میلکڑ روڈ کا چکر لگایا۔ آگے
آگے کشمیری باجا تھا۔ یونسی کی شلوار تیشوں میں لباس کشمیری کے قواڑ
قراقلی کی ٹوپیاں پہنے ٹھکانا بیاں اور شہنائیاں بجاتے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے
چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے سوہنی کا روایتی بیڑ تھا۔ لڑکی والے بھی
امرتسر کی کشمیری تھے۔ جب ہارات لڑکی والوں کی گلی میں داخل ہوئی تو کشمیری
بیڑ بڑا تھا۔ ہارات پر پیسے لٹائے گئے۔ گلی میں جنو قاتیں گئی تھیں۔ دوسری
طرف دیکھیں دم بھاری تھیں۔ لڑکی والے اور لڑکے والے سب ایک
دوسرے کو جانتے تھے۔ کہانا منی ٹائی نے پکایا تھا۔ وہ بھی امرتسر کا تھا۔ ہارات
جنو کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میری ایک جانب اشتقاق بیٹھا تھا وہ سری
طرف گوا ملٹی کے مشہور آزمحق حاجی صاحب بیٹھے تھے۔ منی بانی دیکھیں
چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور حاجی صاحب کی طرف جھپک کر بڑی رازداری کے
ساتھ ہولا۔

”حاجی صاحب! بڑا دل دار دروہ پکایا ہے میں نے۔“

”تھا۔“

یہ کہا اور حاجی صاحب کا جواب سے بغیر پیسے آیا تھا ویسے ہی تیز تیز
قدموں سے واپس چلا گیا۔ اشتقاق میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ دروہ واقعی اس
نے بیسے کمال کا پکایا تھا۔ شام کو دلمن کی ڈولی روانہ ہوئی تو اس پر سے بھی
پیسے اور اکینیاں زونیاں لٹائی گئیں۔ جب تک ڈولی بہت روڑ پر رہی آگے
آگے کشمیری باجا ہی بجاتا رہا۔ جب ہارات چوک میں پہنچی تو میں نے اور اشتقاق
نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور پھر سب کی آنکھ بچا کر وہاں سے کھٹک گئے۔

گواہ ملٹی کے چوک سے شاہ ابو الیالیٰ کی طرف آئیں تو آہستہ جاکر ایک گلی بائیں ہاتھ کو مڑتی ہے۔ اس گلی میں میرے ایک باذن اور غیر بصورت بائیں کرنے والے امرتسری دوست کا مکان تھا۔ اس کا نام طفیل تھا۔ طفیل کو ادب اور موسیقی سے زبردست لگاؤ تھا۔ اس نے جب سنا کہ اشفاق احمد شیراز ہو گئی تھی میرے ساتھ آتا جاتا ہے تو وہ ایک دن صبح صبح میرے مکان پر آ گیا۔ بیکٹوں پر ان دنوں پھینٹیاں کھلی ہوئی تھیں۔ گلی میں سے آواز دے کر بلایا کرتے تھے۔ طفیل نے بھی نیچے سے مجھے آواز دی۔ وہ مری یا تھیری آواز پر میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے طفیل نے جھپٹ لگاتے ہوئے کہا۔

”مولانا نیچے آنا۔ بڑی سپر سائیک بات کہتی ہے۔“
طفیل کی اپنی دشمن تھی۔ وہ اپنی گفتگو میں سب کو ادا کرتے ہوئے قیاسی مانتیسی ایجادات کے لفظ اور اصطلاحیں بے دریغ استعمال کرتا تھا۔ آپ اگر میں اس کے زانیہ لگتے وقت کوئی اصطلاح بھول جاؤں تو وہ گدھر کر دیتے گا۔

میں گلی میں آیا تو طفیل تھوڑی دیر تک گردن پیچھے کئے بالکل سیدھا کھڑا میری طرف دیکھ کر مسکراتا رہا پھر بولا۔

”خواجہ حبیب ایہ بیت تمہیک نہیں ہے اشفاق احمد صاحب گواہ ملٹی

میں آئیں اور ہماری ان سے تو کوئی میں نہ ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا

ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ اشفاق میرے ساتھ یہاں آتا ہی رہتا ہے اسے لے کر میں ہمارے پاس بھی ضرور آؤں گا۔ طفیل نے قہقہہ لگایا۔

”تو پھر اس سبکدوش آج دھپ کو ہی ہو جانا چاہیے۔ انہیں ایسے دیدہ

دیب کر بیٹے گوشت کھلاؤں گا کہ امرتسر کا نقشہ سامنے آ جائے گا“

میں نے کہا۔

”یار یہ نہیں آج دھپ کو اس کی کیا ضروریات ہیں۔ مجھے پہلے اس سے مل کر ملے کر لینے دو“

طفیل نے ایک ہاتھ اپنے کان کو لگا لیا اور بلند آواز میں بولا۔

”خواجہ حبیب! خدا کو جان رہی ہے اس معاملہ ڈان ہو گیا۔ شو شکیں

پیک اپ میں انہی حاتی صادق سے، مٹھ کا گوشت بے جا رہا

ہوں“

میں اسے آواز میں ہی دیتا رہ گیا اور طفیل پیچھے دیکھنے بغیر ہاتھ سے لٹی میں اشارے کرتا آگے نکل گیا۔ میں جلدی جلدی نما دھو کر سیدھا اشفاق کے گھر پہنچا اور اسے کہا کہ دوپہر کا کھانا گواہ ملٹی میں طفیل کے گھر ہے۔ میں نے اشفاق کو راضی کر لیا۔ دھپ تک میں اس کے ساتھ ہی رہا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں اسے لے کر گواہ ملٹی آ گیا۔ گلی میں طفیل کے گھر کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے اسے آواز دی۔ نیچے کی جین اٹھ کر اس نے مجھے اور اشفاق کو دیکھا اور وہیں سے بازو اوپر اٹھا کر بولا۔

”یہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے میں نیچے لینڈ کر رہا

ہوں۔“

اشفاق احمد سے طفیل بڑی گر جوشی ہے۔ بلا اس کے انسانوں کی اپنی خاص زبان میں تعریفیں کرنے لگا۔

”ہوئے ہم بائیک افسانے تھے ہیں آپ نے اشفاق حبیب اس سے

گھر لائٹ کرا لیا ہے۔ اوپر تحریف لائیں“

ہم دوسری منزل کے کمرے میں آ کر پرانے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ طفیل

کو موسیقی کا بے پناہ شوق تھا۔ ایک ریکارڈ پلیئر اس نے رکھا ہوا تھا۔ وہ گیتا

رائے اور جو تھیکا رائے سنگھ اور مہنگی ملک کے لائٹ لے ریکارڈ اس نے

بڑی تک و دو کر کے جمع کئے ہوئے تھے۔ اشفاق کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

”اجازت ہے سر“

اور اس نے میوزک ڈائریکٹر سجاد کی بنائی ہوئی دھن میں گیتا رانے کا
گایا ہوا ایک ریکارڈ لگا دیا۔
درشن پیاسی آگئی داسی
جک جک ویپ جلائے
پر جمو چرن کی دھول ملے تو
جیون میں سکھ پائے

ریکارڈنگ کے ساتھ گفتگو بھی جاری رہی۔ طفیل نے افسانوی ادب پر
جب اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ شروع کیا تو اشفاق بڑا متاثر ہوا۔ پھر تھوڑی
دوئیاں کر کے گوشت دانی اور خربزہ آگئے۔ اس کے بعد سبز کشمیری
پائے کا دور چلا۔ طفیل بڑا خوش تھا۔ اس نے اپنے ایک اور دوست کو بھی
مدعو کیا ہوا تھا۔ وہ دوست زیادہ تر خاموش رہا۔ لیکن ہر کسی کی بات پر سر ہلا کر
اس کی بات میں ہاں ضرور بھرتا۔ اگر اشفاق کوئی بات کر رہا ہو تا تو یہ خاموش
دوست اس کی طرف ٹنگی باندھے نکلا رہتا اور اس کے چہرے پر الفاظ کے
مقابل خاموش تاثرات ابھرتے رہتے۔ جب اشفاق فیصلہ کن انداز میں کسی
بات کی تصدیق یا نفی کرتا تو خاموش دوست فوراً یوں سر ہلا دیتا جیسے کہہ رہا
ہو۔ بات ہوئی نا۔ آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ طفیل نے ایک بار اس کی
طرف اشارہ کر کے اشفاق سے کہا کہ میں اسے خاموش فلموں میں سے نکال کر
لایا ہوں۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو طفیل نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اشفاق
کے ساتھ بڑی کمرہ نشینی سے ہاتھ ملاؤ اور اس کا بار بار شکریہ ادا کرتے ہوئے
بولے۔

”اشفاق صاحب! بقول سعادت حسن منٹویہ بڑی ویپ فوگ دعوت
تھی“

ہم گوالہڑی کی گلیوں میں سے گزرتے میگوڑ روڑ کی طرف جا رہے
تھے۔ اشفاق کہنے لگا۔

”یار اکیسے کیسے نادر زمانہ لوگ ان گلیوں میں رہتے ہیں۔“
میرا فلمی دنیا کے ساتھ بھی ایک سلسلہ بن گیا تھا۔ اس عہد کے نامور
اور کامیاب فلم ڈائریکٹر اور پروڈیو سرانور کمال پاشا نے مجھے اپنے یونٹ میں
لے لیا تھا۔ وہاں میرے بڑے دوست بن گئے تھے۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت
سے بھی لوگ مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ ان میں میرے ہم عمر بھی تھے اور
مجھ سے بڑی عمر کے بزرگ بھی شامل تھے۔ میری اکثر راتیں فلمی ماحول میں
کسی شو بھوس میں سیٹ پر گزرتی ہیں باقاعدہ کوئی فلم تو نہیں لکھ رہا تھا لیکن
پاشا صاحب کے لئے کسی نہ کسی سکرپٹ پر کام ضرور کرنا رہتا تھا۔ فلم کے لئے
لکھنے کا میرے دل میں کوئی زیادہ شوق بھی نہیں تھا۔ میری ساری توجہ تخلیق
کرنے اور ان مچھلیوں کے بارے میں الہا بنے لاول اور ٹالٹ وغیرہ لکھنے کی
طرف تھی۔ لیکن اٹھنا بیٹھنا فلم کے لوگوں کے ساتھ ضرور تھا۔ رائل پارک
ان دونوں فلمی دنیا کا اہم ترین مرکز تھا۔ یہاں کے برٹل اور ویسٹ اینڈ ہوٹل
میں اس زمانے کی بڑی اہم فلمی شخصیتیں سکرین پر نظر آتی تھیں۔ ایسے نوجوان
بھی آکر بیٹھتے تھے جو بعد میں بڑے نامور میوز اور فلم کے پروڈیو سر بنے اور
جنہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

قیام پاکستان سے پہلے رائل پارک کے فلمی دفاتر پر ہندوؤں کی اجارہ
داری تھی۔ اگرچہ اداکار اور ڈائریکٹر زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ ہر کلاس کی
سیٹائی بھی مسلمان ہی کرتے تھے۔ پاکستان بنا تو ہندو چلے گئے اور رائل پارک
کے دفاتر اور عمارتیں مسلمان صاحبزادوں کو الاٹ ہوئے لگیں۔ آج کل تو یہاں
زیادہ تر فلمی دفاتر ہی قائم ہیں مگر شروع شروع میں ہر طبقے کے لوگ یہاں آکر
آباد ہو گئے تھے۔ ایک بلڈنگ کی پہلی منزل ہمارے ایک جانے والے
عبدالستین صاحب نے اپنے نام الاٹ کرائی تھی۔ مجھے یاد ہے اس کے کمرے
بالکل خالی تھے۔ ایک بیڑے کمرے میں صرف ایک صوفی پڑا تھا۔ یہاں کچھ
روز میں احمد راہی اور ساحر لدھیانوی ایک ساتھ رہے تھے۔ بحر علی پھر یہ

بلڈنگ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور اب وہاں سرکاری دفاتر قائم ہیں۔

اس رائل پارک کی گلیوں میں ہر قسم کے لوگ رہا کرتے تھے۔ کوئی جانور نہ تھا۔ کس کا کی تعلیق ضلع گورداسپور ہو شیار پور یا میرٹھ سے تھا تو کوئی کھی گاؤں سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ ہمیں ایک گلی میں ضلع امرتسر کے ایک بزرگ بھی آکر رہنے لگے تھے۔ وہ اپنے ایک بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ بیٹا اوپر والی منزل پر رہتا تھا۔ بزرگ نے گلی والے چھوٹے سے کمرے میں اپنی چارپائی بچھالی تھی۔ یہ لوہے کی چھتالوں والی چارپائی تھی۔ سامنے دو ٹین لوہے کی کرسیاں بڑی راتیں تھیں۔ ان بزرگ کی عمر اس وقت ستر کے قریب ہو گی مگر وہ بچے جیسے جسم میں بڑی توانائی بھری ہوئی تھی۔ باہر کم ہی نکلتے تھے۔ زیادہ وقت چارپائی پر ٹیم وراڈ ہو کر پرانی کتب کے مطالعے میں صرف کرتے۔ انہیں نجوم کے علم پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ مشرقی علوم بھی اذہر کر رکھے تھے۔ میری شہریت ہی سے یہ عادت لری ہے کہ میں صاحب علم لوگوں کا بیٹا لوہ کرنا ہوں اور جہاں کہیں ان کا کوئی سراغ ملے تو ان کے پاس کم از کم ایک مرتبہ ضرور جاتا ہوں۔ میں ایک دن رائل پارک کے پرشل ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے اس بزرگ کا ذکر کیا۔ ان کا اصلی نام تو مجھے کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ سب لوگ احترام سے انہیں شاہ جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

”شاہ جی اس دور کے بڑے پختے ہوئے بزرگ ہیں۔ عین فارسی کے استاد ساتھ انگریزی بھی بولتے ہیں۔“

اس آدمی نے کچھ اس انداز میں شاہ جی کی باتیں کیں کہ میرے دل میں ان سے ملنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ میں اس روز شام سے ذرا پہلے شاہ جی کے دوست خانے پر پہنچ گیا۔ مجھے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ ملت کم کسی سے ملتے ہیں۔ اگر کسی سے ملنا ناگزیر ہو جائے تو مختصر بات کر کے مہمان کو رخصت کر دیتے ہیں۔ میں نے ان کی بیٹھک کے دیوار سے پر دستک

دی تو اندر سے بڑی تیز اور کرخت آواز آئی۔

”کون ہے بھی؟“

میں نے کہا۔

”شاہ جی! میں ہوں۔ آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

اسی لمحے اور اسی کرخت لمحے میں اندر سے آواز آئی۔

”جاؤ جاؤ بھائی اپنا کام کرو۔ میرے پاس کسی سے ملنے کا فضول وقت نہیں ہے۔“

میں فہم نہ ہو کر واقعی یہ آدمی امرتسر کے ضلع کا ہی رہنے والا ہو سکتا تھا۔ میں بھی امرتسر شہر کا پانی پی کر ہوا ہوں ہوا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

”شاہ جی! اگر آپ لوگوں سے نہیں ملتے تو پھر شہر میں کیوں بیٹھ

تے ہیں؟ جگہ کیوں تھیں چلے جاتے؟ یہاں بیٹھیں گے تو آپ سے صحبت کرنے والے آپ کے پاس ضرور آئیں گے۔“

اس کا اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اندر سے کسی نے کڑی انداز میں پھر دہراؤ نہ کیا۔ اور میرے سامنے ایک ڈیلا ڈیلا ہوا ڈھاکڑا تھا جس کا چہرہ تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ یہی شاہ جی تھے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مجھ سے پوچھا۔

”کیا تم امرتسر ہو؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں! خاص امرتسر شہر کا رہنے والا ہوں۔“

شاہ جی نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

”آ جاؤ یا ر اندر۔“

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ لوہے کا چمک دہراؤ کے ساتھ لگا تھا۔ دیواریں بالکل خالی تھیں۔ کوئی کیلڈر تک نہیں لگا تھا۔ چمک کے پاس فرش پر سنی کی سراجی بڑی تھی جس کے اوپر تانبے کا گلاس لونڈا ہار رکھا ہوا تھا۔ چمک کی ایک جانب

پرانی کتابیں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ شاہ جی جگ پر غم و راز ہو گئے۔

”کیا ہم گئے بھائی؟ چائے منگواؤں؟“

میں نے کہا۔

”جی نہیں شکریہ امیں تو صرف آپ کا دیدار کرنے آیا ہوں۔“

شاہ جی غلٹ کر بولے۔

”کیوں بھائی امیں کوئی فلم ایکٹریس ہوں کہ جس کا دیدار کرنے آ گئے ہو؟ میں نے جنہیں صرف اس لئے ہمدرد بنا لیا ہے کہ اس قدر

کے رہنے والے ہو۔ تناؤ کیا ہو گئے؟ چائے بنا لوں۔ نہیں بھی چائے پینا چاہتا ہوں۔“

انہوں نے کرا کے دار آواز دے کر اوپر کسی کو کہا کہ چائے بنائے آؤ۔

پھر ایک پرانی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ میں سوپے کی کرسی پر خاموش بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاہ جی نے ورق گردانی کرتے کرتے کتاب ایک دم بند کر دی اور میری طرف اپنی عقلمانی آنکھیں گھما کر پوچھا۔

”ابترسے تم لوگ صحیح سلامت آ گئے تھے؟ کوئی قتل و قتل تو نہیں ہوا؟“

میں نے کہا۔

”جی نہیں۔ ہم سب لوگ خیر خیریت سے لاہور پہنچ گئے تھے۔“

شاہ جی نے سہانے کے نیچے سے کلب شادک کی بلی نکال کر سکرٹ

لگا دیا۔ ایک لمبا کش لیا اور اس کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

”بدا قتل عام ہوا ہے۔ اچھا یہ تناؤ تمہیں میرا پتہ کس لئے بتایا؟“

میں نے اس آوی کا نام بتا دیا جس نے شاہ جی کا ذکر میرے آگے کیا

تھا۔ کہنے لگے۔

”بڑا گم ہا ہے۔ ہر کسی کے آگے میرا ذکر لے بیٹھا ہے اور پھر

لوگ مجھے تنگ کرنے آ جاتے ہیں۔“

رہنم شرمندہ سا ہو گیا۔ دل میں خیال آیا کہ اٹھ کر واپس چلا جاؤں۔

لیکن پھر یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ یہ قلندر ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی

انگ ادا نہیں ہوتی ہیں۔ اگر ان سے کچھ حاصل کرنا ہے تو پھر یہ ادا نہیں

ہذاشتہ کرنی چاہیے گی۔

اتنے میں اوپر سے ایک لڑکا چائے بنے کر آ گیا۔ اس نے کوٹے والی

چھوٹی سی میز کشید کر سامنے کی اور اس پر چائے رکھ کر بغیر کوئی بات کہے اوپر

چلا گیا۔ شاہ جی ابھی تک مٹالے میں تنگ تھے۔ اچانک میری طرف دیکھا

اور حکم دیا۔

”بھائی چائے کیوں نہیں بنا رہے۔ میری پیالی میں کوئی چائے

ڈالنا۔“

میں نے شاہ جی کی پیالی میں آدمی چائے ڈالی۔ اپنی پیالی بھی پوری نہ

بھری۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں تھا چائے کیسے بنی ہوئی ہے۔ چائے کے مٹالے میں

میری بھی اپنی قلندرانہ ادا نہیں ہیں۔ شاہ جی چائے کی پیالی بکڑ کر جگ پر

سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ایک بار پھر کڑک دار آواز میں کہا۔

”لوٹے کوئی ٹسٹ وغیرہ بھی لے آیا کرو۔“

پھر پتہ پڑانے لگے۔ کسی کو گالی دے کر کہا۔

”کوئی نہیں پوچھتا۔ نہ پوچھو۔ میں کہاں تم لوگوں کی پروا کرتا ہوں۔

جہاں جاؤں گا لوگ میرے گرد جمع ہو جائیں گے۔ تمہاری خوش

قسمتی ہے تمہارے گھر میں بیٹھا ہوں۔“

میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا جیسے میں شاہ جی کے گھریلو معاملات

میں داخل دیکھ رہا ہوں۔ اچانک شاہ جی نے میری طرف آنکھیں اٹھا کر

دیکھا اور کہا۔

”نہیں میں بھائی! تم اپنے دل میں ایسا خیال نہ ڈالو۔ تم بھٹس نیت

کے خیال سے مہرے پاس آ گئے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہیں صرف میری باتیں سننے کا ہی شوق یہاں کھینچ لایا ہے۔ اچھا بتاؤ تم کس قسم کی باتیں سننا چاہتے ہو؟
میں کھیلانی سی نہیں بن کر ہوں۔

”آپ جو بھی باتیں کریں گے میں انہیں بڑے شوق سے سنوں گا۔“
اس پر شاہی فرس پڑے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سارے دانت اس عمر میں بھی اصلی تھے اگرچہ پان کھانے کی وجہ سے میلے لگ رہے تھے۔ میں نے یونہی ان سے ان کی عمر پوچھی تو انہوں نے فوراً کہا۔

”میری عمر کی کوئی دو چار سو سال ہوگی“
میں ہنس دیا۔ کہنے لگے۔

”ہنستے ہو؟“ وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ”تمہارا خیال ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں؟ بھائی میرا تمہارا کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں نے جنہیں جو اپنی عمر بتائی ہے میں اتنی ہی عمر کا ہوں۔“

شاہی نے سگرتے فرش پر پھینکا اور مجھ سے کہا۔
”اس پر پاؤں مار کر بچھاؤ۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ تب میں نے دیکھا کہ فرش پر سگریٹ کھنسنے کے کئی نشان پڑے ہوئے تھے۔ شاہی کے لئے میں نے چائے کی دو مٹری پائی پائی تو بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔

”نہیں کیسے پتہ چلا کہ میں چائے کی دو پیالیاں ایٹ اے ٹائم پیتا ہوں؟“

میں نے کہا۔
”بس دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔“
بولے ”سناں اللہ“ شاہی کی زبان سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا۔
”تم نے میری روح راضی کر دی۔ اچھا۔ میں تمہارا ذائقہ بناتا

ہوں۔ جو پوچھو گے ذائقہ بتائے گا۔ بولو تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے؟“

میں نے کہا۔

”شاہی اگر تاریخ پیدائش ہی معلوم کرنی ہے تو پھر آپ کے ذائقہ بتانے کا فائدہ کیا؟“

اس پر شاہی ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ پھر پوچھا۔

”کی جی بتاؤ یہ بات۔ تمہیں کس نے بتائی ہے؟“
میں نے کہا۔

”یقین کریں شاہی مجھے کسی نے نہیں بتائی۔ بس یونہی دل میں خیال آ گیا تھا۔“

شاہی نے کنگ شارک کا یا سگریٹ لگایا۔ تبھی ہوئی تیلی فرش پر پھینکی اور سگریٹ کا گھبراہٹ لگا کر لے لے۔

”اچھا۔ یہ خود دار اب تم جاؤ۔ پھر کسی وقت آنا۔“
میں سلام کر کے دروازے کی طرف بڑھا تو شاہی نے کڑک کر کہا۔

”مہرب بھی آنا اسی وقت آنا۔ اور دروازے پر زور سے ہاتھ نہ مارنا۔ سمجھ گئے؟“

میں نے کہا۔
”جی سمجھ گیا۔“

شام کے وقت اخلاقی احمد سے ملاقات ہوئی تو میں نے ایسے شاہی کی دلچسپ شخصیت کے حلق بتایا تو وہ کہنے لگا۔

”میں میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“
○

اشفاق احمد کو تصوف کے مسئلے مسائل سننے اور بیان کرنے کا شوق ہی سے بڑا شوق تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شاہ جی سے مل کر بڑا غش ہوگا۔ چنانچہ میں وقت مقررہ پر اسے ساتھ لے کر شاہ جی کے مکان پر پہنچ گیا۔ شاہ جی کی ہدایت کے مطابق میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ وہ مری دستک پر شاہ جی نے خود دروازہ کھولا۔ ہمیں ایسے دیکھا جیسے پچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے پچان لیا اور اندر آنے کا اشارہ کر کے واپس چلے گئے۔ اشفاق احمد نے مجھے شرارتی نگہوں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

"آجوا! یہی شاہ جی ہیں۔"

ہم نے کمرے میں جا کر شاہ جی کو سلام کیا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور بیٹھے کا اشارہ کیا۔ آج ساری باتیں اشاروں میں ہو رہی تھیں۔ میں اور اشفاق کوپے کی کالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مہر کا مہینہ تھا۔ کمرے کی فصاحت و شکوہ تھی۔ شاہ جی چنگ سے ٹیک لگائے کسی بوسیدہ سی کتب کے مطالعے میں بہتک تھے۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔ شاہ جی ہنس پڑے۔

"واو! کیا غلط شعر لکھا ہے اس شاعر نے۔"

پھر کتاب بند کر دی اور اشفاق احمد کی طرف متوجہ ہوئے۔

"چرا تو کہتے ہیں انسا نہ نظر اشفاق احمد؟"

اشفاق احمد شرمیلی ہنسنے لگا۔

"پہلے ہی بس تھوڑا بہت لکھ لیتا ہوں۔"

شاہ جی ٹھک کر پڑے۔

"بھائی! تھوڑا کھو یا بہت کھو۔ یہ تھوڑا بہت کیا ہوا؟"

تصوف کی باتیں شروع ہو گئیں شاہ جی کہنے لگے۔

"یہ تصوف جس کا ذکر عام لوگ کرتے ہیں اُن تک میری سمجھ میں

نہیں آیا۔ اچھا بھائی اشفاق احمد تم بتاؤ۔ تم تصوف کسے سمجھتے ہو؟"

اشفاق احمد نے جواب میں کچھ کہا۔ شاہ جی بڑے غور سے سنتے رہے۔

"اوپر والا بچے جانے بھولا دے۔"

آہم کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے کانپ سے گئے۔ اشفاق احمد کے ہاتھ سے بات کا سرا نکل گیا۔ اس نے دماغ پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی تو شاہ جی بولے۔

"دماغ پر زور مت ڈالو بھائی اشفاق احمد۔ لو مگر یہ بیوقوف۔"

اشفاق نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں مگر یہ نہیں چیتا۔"

"اور کیا پیچ ہو؟ شراب؟"

شاہ جی نے اشفاق کی طرف ذرا سا جھک کر پوچھا اشفاق اور زیادہ شراب گھیا اور شراب سے ہونے والی باتیں سر ہلاتے لگا۔ شاہ جی ہنستے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر میری طرف دیکھا اور بولے۔

"بھائی! تمہارا یہ دوست مشتاق احمد بڑا مزے دار آدمی ہے۔"

میں نے کہا۔

"شاہ جی! اس کا نام مشتاق احمد نہیں اشفاق احمد ہے۔"

شاہ جی نے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے یاد۔ مجھے معلوم ہے، مجھ سے بحث نہ کرو۔"

اتنے میں اوپر سے وہی فوجوان جو خاموش رہتا تھا چائے لے کر آیا۔

اس نے حسب معمول خاموشی سے کہنے والی نیکی پر چائے کا زبرے رکھا اور اگلے پاؤں واپس چلا گیا۔ شاہ جی نے مجھے کہا۔

"زال دو پائیل میں چائے۔ یاد ہے نا؟ مجھے چائے کی اوجھی پیالی دینا۔"

ہم چائے پیئے۔ لگے اشتقاق احمد نے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ شاہ جی اس کے ہر سوال کا جواب بڑے دلیل انداز میں یعنی دلیل کے ساتھ دیتے جاتے۔ جہاں اشتقاق احمد کو کچھ اختلاف ہوتا اور وہ اس کا اظہار کرتا تو شاہ جی کہتے۔

"تم اختلاف کو اپنی جگہ پر قائم رکھو میں کب کہتا ہوں کہ اختلاف دور کرو؟ جو بات اچھی لگتی ہے اسے مان لو۔ جو اکیل نہیں کرتی اسے منظور نہ ہاں آگے بڑھو۔"

اشتقاق احمد بھی بولنا جانتا تھا۔ وہ خوب بولتا رہا۔ مگر تک دونوں میں تصوف کے مسائل پر باتیں ہوتی رہی۔ میں ان کی بحث بڑے غور سے من رہا تھا۔ چائے کا دوسرا اور پھر تیسرا در چلا۔ ہر بار شاہ جی اسی کڑک دار آواز میں غور لگاتے۔

"لو پڑا لو اور چائے بھیج دو۔"

اور وہ خاموشی سے کہنے لگے کہ آجاتا جس کے بارے میں شاہ جی نے فرمایا تھا کہ میں اسے خاموش فلموں میں سے نکال کر لایا ہوں۔ ان کی بحث سے مجھے عظیم ہوا کہ یہ ساری باتیں اور سارے مسائل میں پہلے ہی امرتسر میں من چکا ہو۔ میرے لئے ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہاں اگر مجھے کوئی بات اچھی اور صحیح لگی تھی تو وہ شاہ جی کی شخصیت تھی۔ وہ بڑے دلچسپ آدمی تھے اور ان کا باتیں کرنے کا انداز بھی سب سے الگ تھلک تھا۔ مسئلے مسائل پر باتیں کرتے کرتے وہ اپنا تک رک جاتے اور کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس کا بڑے بحث موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا مثلاً ایک بار وہ امام غزالی پر بڑی

دلیل باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم خاموش ہو گئے۔ تاک کو دو تین بار اوپر چڑھا کر سوس سوس کیا اور کھلے میں کسی کو گالی دے کر بولے۔

"اس نے پھر منی کے تیل والا چو لہا جلا ہے۔ منی کے تیل کی بو مجھے ذہر لگتی ہے۔"

اس کے بعد وہ امام غزالی کو بھول گئے۔ تنگ شادک کا سرگٹ ساگا کر بولے۔

"سنو! جنہیں زمانہ جاہلیت کے ایک عرب شاعر کے شعر سنا ہوں۔"

پھر پہلے انہوں نے عرب شاعر کے عربی اشعار سنائے پھر اس کا ترجمہ کرتے سنایا۔

"ان شاعروں پر ہمارے علاقے میں کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔ ہمیں وہاں بیٹھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اشتقاق احمد بھی انھنے کے سنے پر تون رہا تھا۔ ہم اجازت لینے ہی والے تھے کہ شاہ جی نے ہلکے کے چلو میں رکھی بوسیدہ کتاب انصافی اور ہلکے کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے۔

"چھا! اچھا۔ اب تم لوگ جاؤ۔ پھر کبھی باتیں کریں گے۔"

ہم دروازہ بند کر کے گلی میں آئے تو ہمیں شاہ جی کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ خاموش فلموں سے نکالے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہو کر انہوں نے غور لگایا تھا۔

"اے برتن اٹھا کر لے جاؤ۔"

میں نے گلی میں سے گزرتے ہوئے اشتقاق سے پوچھا۔

"وہ کیا خیال ہے تمہارا؟"

اشتقاق بولا۔

"یار بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ بہت لائق بھی ہے۔ یاد کیسے کیسے لوگ

عمر کی گلیوں میں گناہم پڑے ہیں۔ اب تم ان کا خیال اپنے ترقی پسند اور رجعت پسند دانشوروں سے کرو۔ تمہیں زمین آسمان کا فرق لگے گا۔

میں نے کہا۔

”یہ تو ہے۔“

اشفاق نے کہا۔

”میں کبھی کبھی شاہجی کے پاس ضرور آیا کروں گا۔“

مجھے نہیں معلوم کہ اشفاق شاہجی سے ملنے والے پارک کبھی کبھار جاتا تھا یا نہیں لیکن میں سمجھتی تھی کہ ایک پھیرا شاہجی کے پاس ضرور لگاتا تھا۔ اس کی دو دیوہات تھیں پہلی یہ کہ مجھے شاہجی سے زمانہ جاہلیت کے عرب شاعروں کے شعر سننے کا عشق تھا اور دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اسی گلی میں مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو چکی تھی۔ محبت کیا ہوئی تھی۔ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس نے مجھے گلی میں سے گزرنے دیکھا۔ وہ مسکرائی میں بھی مسکرا دیا۔ اس محبت ہو گئی۔ شاہجی کے پاس سے واپسی پر میں اس کے مکان میں چلا جاتا۔ اس نے مکان کی کچھیل گلی والا دروازہ کھلا رکھا ہوتا تھا۔ میں اس لڑکی کو بچنے میں صرف ایک بار ہی مل سکتا تھا۔ اس روز اسے وہاں سے چھٹی ہوتی تھی جہاں وہ سلاخی وغیرہ کا کام کرتے جاتی تھی۔ ہر حال یہ ایک الگ داستان محبت ہے۔ میں اس کا تذکرہ یہاں نہیں کروں گا۔

اشفاق احمد بہت روز ”لیل و نهار“ کا ایڈیٹر بن گیا۔ ”لیل و نهار“ پروکریٹو پیپر کا رسالہ تھا اور اس کا دفتر امروز پاکستان ٹائمز وائی عمارت یعنی بھارت بلڈنگ میں ہی تھا۔ یہ بلڈنگ اب صاف ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ باؤ مارکیٹ بن گئی ہے۔ جہاں سے اگر آپ چاہیں تو آپ کو اطالوی شوژ مل سکتے ہیں۔ اطالوی شوژ آپ کو شہر میں اور کسی جگہ نہیں ملیں گے جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں تب بھارت بلڈنگ اپنی جگہ پر بومیدار حالت میں قائم

تھی۔ اس میں بجلی کے دفاتر بھی ہوتے تھے اور میں اپنے گوالہنڈی والے گھر کا بل جمع کروانے یا بل درست کروانے وہاں جایا کرتا تھا۔ پاکستان ٹائمز اور امروز اخبار کے دفتر میں تو میرا تقریباً روز ہی پھیرا لگتا تھا۔ میرے سبھی ترقی پسند دوست امروز اور پاکستان ٹائمز سے وابستہ تھے۔ ”لیل و نهار“ شائع ہونا شروع ہوا تو وہاں مزید دوست آگئے اور خوب محفلیں لگنے لگیں۔ جس زمانے میں میری ”آفاق“ اخبار میں رات کی ڈیوٹی ہوتی تھی تو میں رات کے ایک ڈیڑھ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ”امروز“ اخبار کے دفتر کا پتہ لگا کر اپنے گوالہنڈی والے گھر جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے گرمیوں کی راتوں کو امروز کا رات کی شفٹ والا عملہ باہر کھلی چھت پر بیٹھا کام کر رہا ہوتا تھا۔ اوپر رسی کے ساتھ بلب روشن ہوتے تھے۔ حیدر ہاشمی شفٹ اخبار چھوٹا ہوتا تھا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھ جاتا۔ میدان باغی میں مجھ سے ضرور پوچھتا کہ ”آفاق“ نے آج کیا ہینے لائن لگائی ہے۔

امروز کے دفتر میں جہاں ایڈیٹر کا کمرہ تھا وہاں سے اس بلڈنگ کی چھریلین روڈ والی ایک کچھ سی قلی نظر آیا کرتی تھی۔ یہ قلی آگے جا کر بند ہو جاتی۔ اس میں شروع شروع میں ہمیں ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔ الاٹ کہاں ہوا تھا میں ہم نے قصہ کر لیا تھا۔ میں اور میرا ایک گوالہنڈی کا دوست اس مکان کی دوسری منزل پر پہلی بار گئے تو مکان تقریباً لوٹا جا چکا تھا۔ ایک الماری پر ابھی تک کالا لگا تھا۔ ہم نے کالا توڑا اور اندر اسکو کی کتابیں، کاپیاں اور ایک پھولی سی مشکوں کی نوکری پڑی تھی۔ میں نے نوکری باہر نکالی۔ نوکری میں ملل کا ایک آدھا کڑھا ہوا رومال تھا۔ ڈی ایم سی کے رنگدار دھانگوں کی تین چار گچھیاں، ایک لیڈی رسٹ وایج اور پانچ روپے کا نوٹ بھی تھا۔ لیڈی رسٹ وایج میرے دوست نے رکھی اور میں نے پانچ روپے کا نوٹ رکھ لیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ یہ کڑھائی ضرور کوئی ہندو یا سکھ لڑکی کرتی ہوگی۔ یہ رسٹ وایج اور پانچ روپے کا نوٹ بھی اسی کا ہوگا۔ خدا جانتے اسے اپنے گھر

والوں کے ساتھ کن حالات میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ خدا جانے وہ زعمہ کی ہوگی یا راستے میں اغواء ہوگئی ہوگی؟ اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہتے تھے مگر مجھے پانچ روپے کے ٹوٹ کی بڑی خوشی تھی۔ میں نے گواگنڈی میں پا کر اسی وقت گئے کھائے تھے۔

اس بلاگک میں ”لیل و نمار“ کے دفتر کی کھڑکیاں میں ہسپتال کی طرف کھلی تھیں۔ ”لیل و نمار“ کا دفتر پہلے پہل ٹکسن روڈ پر انور کار نوٹس والی بلاگک میں ہوتا تھا۔ پہلے فیض صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ پھر میر سبط حسن اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ بد نہیں پہلے وہ تھے کہ پہلے سبط صاحب تھے۔ بہرحال سبط حسن کے زمانے میں ”لیل و نمار“ بڑے کمال کا رسالہ ہوتا تھا اور اس نے کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اشفاق احمد نے آکر ظاہر ہے اس پر اپنی چھاپ لگائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رسالہ ”لیل و نمار“ چوں چوں کا مرید بن گیا۔ اسے پڑھتے ہوئے کبھی لگتا کہ یہ لیل و نمار ہے۔ کبھی لگتا کہ نہیں یہ لیل و نمار نہیں ہے۔ یہ ”وامتاز گو“ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادب میں سبط حسن اور فیض صاحب کا اپنا ایک نظریہ تھا جبکہ اشفاق احمد کا کوئی لے شدہ نظریہ نہیں تھا۔ مجھے نہ تو سبط حسن والے نظریے سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اشفاق احمد کے کوئی نظریہ نہ ہونے سے کوئی سروکار تھا۔ مجھے صرف اشفاق احمد سے دلچسپی تھی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میرا بار ”لیل و نمار“ میں آگیا ہے۔

ادھر ادھر سے بھرتا بھرتا میں ”لیل و نمار“ کے دفتر میں آجاتا اور اشفاق کے پاس بیٹھ جاتا۔ ہم خوب باتیں کرتے۔ پھر اس کے کمرے سے اٹھ کر آرٹس زیدی کے پاس چلا آتا۔ زیدی بڑا اچھا آرٹس تھا اور آدمی بھی بہت کمال کا تھا۔ اس کی قاموش منگٹو میں بڑی گری اور محبت تھی۔ اس کی لائن میں زبردست ایکسپریشن ہوتا تھا۔ اس کے ہائے ہوئے کار ہون لیل و نمار کی جان ہوتے تھے۔

پھر خدا جانے سیاست نے کیا رنگ بدلا کہ اشفاق کی جگہ صوفی جیمس و نمار“ کے ایڈیٹر بن گئے۔ دسی سسی سر صوفی صاحب نے پوری کردی ”لیل و نمار“ ایک گناہ سا پچھتہ بن کر رہ گیا۔ صوفی صاحب کے دفتری رج زبانی تھی۔ وہ اپنا حق ساتھ لاتے تھے۔ ان کی چلم ان کے گھر سے بھر کر جاتی تھی۔ ایک خاص ملازم ہوتا تھا اس کا نام بھول گیا ہوں۔ وہ حق کی اسی چلم لے کر سائیکل پر سوار ہو کر صوفی صاحب کے گھر میں آباد پہنچتا۔ چلم میں خاص اہتمام کے ساتھ تمباکو بھرا جاتا۔ اس کے اوپر کپاس کے بندوں کی آگ جلائی جاتی اور ملازم سائیکل پر بیٹھ کر جب چلم ہاتھ میں لے لیل و نمار کے دفتر میں داخل آ رہا ہوتا تو چلم میں سے دھواں اٹھ رہا اور بن لگا جیسے کوئی اعلیٰ الیکٹریسیٹی کی شمع لے کر پلا آ رہا ہے۔ اس حسن نے ”لیل و نمار“ کو جس مقام تک پہنچایا تھا یہ رسالہ بھڑواں تک نہ رہا اس مقام سے نیچے ہی نیچے گر آگیا اور آخر ایک روز بند کر دیا گیا۔

اب ہم ریڈیو شیشن کی نئی عمارت میں آ گئے تھے۔ یہ عمارت امپیریلز کے ٹھکانہ پرانے والے کونے کے شروع میں واقع ہے۔ ایک مدت تک دستہ زیر تعمیر رہی۔ عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ اس میں ساز و سامان بھی لگا دیا۔ ہر ریڈیو کے عملے کو منتقل نہیں کیا جا رہا تھا۔ جن لوگوں نے عمارت بنائی وہ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ مزے سے رہ رہے تھے۔ ان ہی دنوں دن کچھ پاپاک بھارت جہڑیں شروع ہو گئیں۔ میڈک ڈائریکٹر شہریار نے نور جہاں آواز میں مشہور علی ترانہ پرانے ریڈیو شیشن کی بجائے نئے ریڈیو شیشن میں جا کر دیکارڈ کر دیا۔ یہ ملی نغمہ تھا۔

اے - وطن کے جیلے بھوانا

میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

نغمہ نگار قتیل شفائی تھا مگر نام جیل الدین عالی کا لکھا گیا۔ اس کی بھی یہ وجہ تھی جس کا ذکر کرنا میں یہاں مناسب نہیں سمجھتا۔ اتفاقاً ضرور کہوں گا

کہ جمیل الدین عالی کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے ہم لوگ پرانے ریڈیو کی پوسیدہ عمارت کو پیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر نئی عمارت میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد من پینشن کی پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی۔ اشتقاق احمد اب باضابطہ طور پر ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک نہیں تھا۔ مگر ریڈیو کے لئے مسلسل لکھتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ایسے ایسے ریڈیو ڈرامے اور منچر لکھے جو یادگار رہیں گے۔ اس کا مقبول عام منچر ”تلقین شاہ“ چل رہا تھا اور ترقی کی منازل طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو تلقین شاہ منچر اپنے نقطہ شروع پر پہنچ گیا۔ ریڈیو پاکستان لاہور نے بھی پاکستان بھارت جنگ میں اپنا قومی کردار دوسرے اداروں کی طرح بذی کامیابی سے نبھایا۔ شرکاء کوئی ادیب اور شاعر اپنا نہیں تھا جس نے ریڈیو کو اپنی بلا حواسہ خدمات نہ پیش کی ہوں۔

اشفاق احمد تلقین شاہ کے ساتھ دوسرے منچر بھی لکھتا۔ تقریریں بھی کرتا اور اپنے دوسرے ساتھی ادیب اور شاعروں کے ساتھ قوم کے جذبول کو بلند رکھنے کے لئے اپنا ملی فرض ادا کرتا رہا۔ میں اب ریڈیو کے ساتھ باقاعدہ طور پر منسلک ہو گیا ہوا تھا اور سارا دن بلکہ رات گئے تک ریڈیو سٹیشن پر ہی رہتا۔ کوئی منچر لکھتا ہوتا تو منچر لکھتا۔ چھوٹی سی تقریر لکھتی ہوتی تو وہ بھی لکھتا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ قوم اس آزمائش میں سے سرخ رو ہو کر نکلی۔ قوم کو ایک نیا جذبہ ایک نئی طاقت ملی۔ ریڈیو کے پروگراموں کو نئے تقاضوں کی روشنی میں ترتیب دیا گیا لیکن جیسا کہ قوموں کی تاریخ میں اکثر ہوتا آتا ہے کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ریڈیو کے پروگرام پھر پرانی ڈگر پر واپس آ گئے۔ اس کے باوجود اشتقاق احمد ”میرزا ادیب“ ناصر کاظمی اور صوفی عجم ایسے انہوں اور شاعروں نے ریڈیو کے معیار کو کافی حد تک بلند کئے رکھا۔

اشفاق کے ساتھ میرا سنے ریڈیو سٹیشن والا زمانہ بھی بڑا یادگار زمانہ تھا۔ اگرچہ وہ ریڈیو سٹیشن دور نہیں آتا تھا مگر بہتے میں دوبار اس کا پھیرا ضرور

ہوتا اور ہم کافی وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے۔ کبھی کمرے میں جا بے۔ کبھی ریڈیو کی کنکٹیں میں ڈبک کر پائے پیتے اور کبھی سنوویو کے اندر ہی بیٹھے دیر تک باتیں کرتے۔ اسی دوران نئی ویڈیو سٹیشن قائم ہو گیا۔ یہاں اشتقاق احمد کے مزید جو کچھ لکھے۔ اس نے اور بانو قدسیہ نے مل کر ٹیلی ویژن کے لئے لکھنا شروع کر دیا۔ مل کر لکھنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ دونوں ایک پلے مل کر لکھتے تھے۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ دونوں الگ الگ ڈرامے اور سیریل وغیرہ لکھتے تھے۔ اشتقاق نے ٹیلی ویژن پر ریڈیو کے اپنے منچر ”ٹاپلی دے تھیلے“ کو پھر سے شروع کر دیا۔ جسے لوگوں نے پسند کیا۔ پھر اس نے ایک محبت سو افسانے کے نام سے ڈراموں کا سلسلہ لکھا۔ یہ ڈرامے وہ اپنی مرضی سے بغیر کسی کا خیال کئے لکھتا۔ لوگوں کو بعض اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ بعض نے کہا کہ ڈراموں میں کردار بڑے لمبے لمبے ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ تحریر کوئی طور پر یہ سلسلہ بھی بہت پسند کیا گیا۔

اب میں تھوڑا اور پیچھے کی طرف جانا ہوں۔

اشفاق نے ماڈرن ٹائمن میں زمین لے کر اپنا مکان بنانا شروع کیا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس نے مجھے وہ پلاٹ دکھایا۔ یہ پلاٹ بلاک میں تھا اور ماڈرن ٹائمن میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو تھا۔ اس وقت تو وہاں بڑی ہی پرسکون فضا تھی۔ اب اس فضا کے سکون میں رکشوں وغیرہ نے تھوڑا خلل ڈالا ہے۔ پھر یہی خسرو والا حال نہیں ہے۔ میں نے اشتقاق سے کہا کہ پلاٹ کے درمیان میں ایک ورڈسٹ ضرور لگائے۔ اس نے اپنی پسند کے ذریعہ ہائیں بھی لگوائے جو اب کافی بوے ہو گئے ہیں۔ اس کو غصے کا نقشہ اس نے خود تیار کیا تھا۔ یعنی وہ جس طرح کامکان یا مکینک چاہتا تھا اس نے اسی طرح کی کوٹھی بنوائی۔ ڈرائسنگ روم لمبا اور کافی کشادہ ہے۔ سامنے والی ساری کی ساری دیوار میں مونے شیشے لگے ہیں جس سے روشنی قریب آتی ہے اور شور بھی باہر ہی رہتا ہے۔

اس سے بھی پہلے کی بات ہے کہ لاہور میں ایک نوجوان کے ہاتھوں لڑائی بھگڑے میں دوسرا آدمی شدید زخمی ہو گیا اور ہسپتال میں جا کر فوت ہو گیا۔ اس نوجوان پر مقدمہ چلا اور اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ باپ نے اپیل کی۔ ہائی کورٹ اور اس کے بعد سپریم کورٹ نے بھی سزا بحال رکھی۔ پورے باپ اٹھ بار آنکھوں کے ساتھ اشفاق احمد کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس نے جیل بوجھ کر کسی کو نہیں مارا۔ میں لڑائی ہوئی اور مخالف کا خون ہو گیا۔ اب اس کی رحم کی اپیل صدر ایوب کے پاس گئی ہوئی ہے۔ اگر اسے پھانسی ہو گئی تو اس کے ساتھ میں بھی مرجائیں گا۔ اس کی بہنیں اور ماں بھی مرجائیں گی۔ ہمارا سارا گھر مرجائے گا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میرے بچے کو بچا لیتے۔“

اشفاق احمد نے کہا۔

”محترم! مجھے آپ کے ساتھ پوری ہمدردی ہے مگر میں اس مسئلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

اس وقت تک اشفاق احمد کہتا ہے کہ میرا خیال ہے اس دوست کی طرف نہیں گیا تھا ہر ان دنوں صدر ایوب کا ایک طرح سے پی آر لوہو تھا۔ یہ نصیب لڑکے کا غم زدہ باپ یہ سارا کچھ معلوم کر کے اشفاق کے پاس پہنچا تھا۔ چنانچہ جب اس نے پی آر او کا نام لے کر کہا کہ آپ انہیں کہیں کہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے صدر ایوب سے میرے بچے کی رحم کی اپیل منظور کراویں۔ تب اشفاق احمد ساری بات سمجھ گیا۔ لیکن اس نے لڑکے کے باپ کو زیادہ تسلی نہ دی کیونکہ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

”محترم! میں انہیں فون کر کے ضرور سلام کروں گا کہ وہ اس مسئلے میں کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

یہ نصیب لڑکے کا باپ رونے لگا۔ اس کی بیٹی بندھ گئی۔ اشفاق خود جب اولاد تھا۔ اس کا دل دھل گیا۔ اس نے فوراً کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لڑکے کے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ہو گا تو سب کچھ وہی جو خدا کو منظور ہو گا۔ مگر میں ایک بار کوشش ضرور کر کے دیکھتا ہوں۔ اگر بچے کی زندگی باقی ہے تو وہ انشاء اللہ ضرور بچ جائے گا۔“

لڑکے کے باپ کی جان میں جان آگئی۔ کیونکہ کسی نے اس سے کہا تھا کہ اگر اشفاق حامی بھر لے گا تو پھر آپ کا کام ہو جائے گا۔ اشفاق احمد نے حامی بھری اور شام کو میرے پاس آ کر مجھے سارا قصہ لایا اور کہا۔

”تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

میں اسی وقت چار ہو گیا۔ شاہراہ انجینئریس ان دنوں غنی بنی چلی تھی۔ میں نے اس ٹرین میں دو سلیپر بک کر اسے اور کراچی روانہ ہو گئے۔ اشفاق نے اپنے دوست کو کراچی میں ٹیلی فون کر دیا تھا کہ وہ ایک استثنائی ضروری اور ذاتی مسئلے پر بات کرنے آ رہا ہے۔ وہ میرا بھی دوست تھا۔ میں اس کا فرضی نام شہباز لکھ دیتا ہوں۔

ہم کراچی پہنچنے کے بعد ٹیکسی میں شہباز کو سیدھے شہباز کی کوشی پر آ گئے۔ وہ ہمارا ہسٹل تھا۔ ہمیں دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ فوراً اشفاق سے پوچھنے لگا۔

”بات کیا ہے؟ غیر تو ہے۔ تم تو غنی آتے والے نہیں ہو۔“

اشفاق نے کہا۔

”ذرا سانس تو لینے دو۔ ساری بات جانتا ہوں۔“

شام ہو رہی تھی۔ ہم کوشی کے ٹریس میں بیٹھ گئے۔ کراچی کی شام کی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ہوا میری بھی محبوبہ رہ چکی ہے۔ یہ ہوا ہی مجھے لاہور

سب تکمیل تک پہنچنے کے بعد شہباز بولا۔

”اگر اس لڑکے کی رحم کی اپیل صدر کے پاس آتی ہوگی ہے تو میں سب سے پہلے اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے دیکھنے اور فائل کو پڑھنے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

دوسرے روز دفتر جانے کے بعد شہباز نے رحم کی اپیل والی فائل کا پورا مطالعہ کیا۔ دوپہر کے بعد کوٹھی پر واپس آیا تو کہنے لگا۔

”اشفاق یاد را اس میں تو جتنی طور پر کوئی بھی نقطہ امن لڑکے کے حق میں نہیں جانتا یہ فائل جعفر کے سامنے گئی تو نہ رحم کی اپیل مسترد کروے گا۔ کیونکہ دوسری وزارتوں کی رائے پر نہ کر ہی صدر نے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور یہ تعلق وزارتوں کے سیکرٹریوں نے لڑکے کے خلاف ہی لکھا ہے بلکہ سفارش کی ہے کہ اس کی رحم کی اپیل منظور نہ کی جائے۔“

اشفاق احمد پریشان ہو گیا۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے لڑکے کے باپ کا غم زدہ اظہار چہرہ آگیا۔ اشفاق احمد کہنے لگا۔

”اگر ایسی دیکھی بات ہو گئی تو اس کا باپ ماں بہنیں سب مرجائیں گی۔“

شہباز نے کہا۔

”اس نے بھی تو بڑا ظلم کیا ہے۔ ایک انسان کی جان لی ہے۔“

اشفاق بولا۔

”جس یار جو ہوتا تھا ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو

کچھ کرو۔ میرا مطلب ہے اسے پھانسی نہ ہو عرق نہ ہو جائے۔ یہ

میں ایک طرح کافی سخت سزا ہوتی ہے۔ نہاری جوانی تیل میں غرق

ہو جائے گی اس کی۔“

شہباز سوچنے لگا۔ پھر بولا۔

سے کراچی کھینچ کر لے جایا کرتی تھی۔ میں ان دونوں کراچی جاتے اور اسی ہوا سے ملاقات کرنے کے بجائے تلاش کیا کرتا تھا۔ اور اس کام کے دو تین فوراً کراچی روانہ ہو جاتا۔ سارا دن کسی جگہ بیٹھا شام ہونے کا انتظار کرتا رہتا۔ جیسے ہی شام ہوتی اور سندھ کی طرف سے آئے والی میری محبوبہ ہوا مجھ سے ملے لگتی تو میں بھی اپنی کہیں مجھ سے نکل آتا۔ سید خدایام گروہ میں یا کسی دوسری جگہ بیٹھ کر بیٹھتا اور پھر اپنی محبوبہ کراچی کی شام کی ہوا کی باتیں میں ہانسنے والے سڑک پر نکل آتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے ملنے۔ ایک دوسرے کا حال پوچھتے۔ وہ مجھے دور سندھ باز رہنے والے لوگوں، ان کے شہروں، ان شہروں کے ملکوں، ان ملکوں کے جنگلوں، وہاں کے گرجا گھروں، گرجا گھروں کے پر سکون خوبصورت قبرستانوں، وہاں کے سے خانوں اور ان سے خانوں میں رقص کرنے والیوں کی باتیں بتاتی اور ہم اپنے وار و نیاز میں مصروف سڑک پر نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے۔

اس وقت بھی جب میں اور اشفاق اپنے مشترکہ دوست شہباز کی کوٹھی کے ٹیریس پر بیٹھے تھے تو شام کی ہوا چل پڑی۔ ہوائے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ سندھ کے اوپر سے ہوتی ہوئی سیدھی میرے پاس آتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے اٹھ چلنے کو کہتا۔

میں خود اس کے ساتھ چلنے کو بے تکب ہو گیا تھا۔ مگر میری مجبوری تھی۔ وہاں سے مل نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی چاہی تو شام کی ہوائے کہاں

”میں سب جانتی ہوں۔ تم کہیں ٹھہرو۔ میں جاتی ہوں۔“

اور وہ آئیں بحرانی سکراتی میرا ہاتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس وقت شہباز

اشفاق احمد سے پوچھ رہا تھا۔

”اب کھل کر بات کرو۔ کیا معاملہ ہے؟“

اشفاق احمد نے شہباز سے آج تک ہمارا معاملہ اس کے گوش گزار کیا

”میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ یہ فائیل صدر کے آگے پیش نہ
کوں۔“

اشفاق نے پوچھا۔

”تم کب تک اسے اپنے پاس رکھو گے؟ ایک نہ ایک دن تو ہمیں
یہ فائیل پیش کرنی ہی پڑے گی۔ آخر پھانسی کے کیس کی فائل
ہے۔“

شہباز کہنے لگا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس فائل کے بارے میں حکم ہے کہ جتنی
جلدی ہو سکے اسے آگے دے کر متعلقہ افسر تک پہنچایا جائے۔ پھر
بھی میں تمہاری خاطر کوشش کروں گا کہ اسے جتنی دیر تک غائب
کر سکوں غائب کر دوں۔ جب پیچھے سے ہمت ہی دباؤ پڑے گا تو پھر
مجبوراً فائل کو پیش کر دوں گا۔ آگے جو لڑکے کی قسمت۔ اگر اس
کی زندگی ابھی باقی ہے تو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

اشفاق نے کہا۔

”چلو یہی غیبت ہے۔ تم فی الحال فائیل اپنے پاس ہی رکھو۔“
شہباز فوراً براہ۔

”اپنے پاس نہیں رکھ سکوں گا بھائی میں تو اسے کسی الماری میں بند
کر دوں گا لیکن یہ ضرور بتائے دیتا ہوں اور تم لڑکے کے والد کو بھی
بتا دے گا کہ اگر پیچھے سے زور پڑا اور پیچھے سے زور ضرور پڑے گا تو
پھر مجھے فائیل فائل کر پیش کرنی ہی پڑے گی۔ میں اسے کچھ عرصے
کے لئے غائب تو کر سکتا ہوں مگر اسے ضائع نہیں کر سکتا۔“

”ہاں بھی! یہ تو بالکل ناممکن ہے۔“

اشفاق نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ یہی بات بہت تھی۔ مگر نہ
کوئی اتنی خطرناک ذمہ داری لینا ہے۔ صرف اشفاق کے گھنے پر شہباز اس

خطرناک کام کے لئے تیار ہو گیا تھا اور اشفاق محض ایک غم زدہ باپ اور اس
کی اولاد سے محبت کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا تھا۔

بہم دور راتیں کراچی میں گزارنے کے بعد لاہور واپس آگئے۔ لڑکے کا
باپ بے چینی سے امید و بیم کے عالم میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اشفاق کے
مکان پر بیٹھا تھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ اشفاق احمد نے بڑی دانشمندی کے ساتھ
آہستہ آہستہ اسے ساری بات بیان کر دی۔ لڑکے کے باپ نے لہجہ بھری
اور بولا۔

”خدا کپ کے بچوں کو سلامت رکھے۔ میرے لئے اتنی تسلی ہی

بست ہے۔ آپ نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے۔ میرے اللہ نے حلال
تو میرا بیٹا ضرور بچ جائے گا۔“

وقت گزرنے لگا۔ لڑکے کا باپ دو مرتبہ میرے روز اشفاق کے پاس آ
کر پتہ کر جاتا۔ وہ سکرپٹ بھی جاتا۔ یہ معلوم کرنے کہ کہیں کراچی سے
فائیل واپس تو نہیں آگئی۔ مگر فائیل تو شہباز نے الماری میں بند کر کے رکھ دی
تھی۔ بس اللہ توکل ہی رکھ دی تھی کہ اگر پیچھے سے زور پڑا تو جتنی دیر تک
ٹال سکا جیل کی بلڈار کو ٹالوں گا۔ جب بے بس ہو گیا تو فائیل پیش کر دوں گا۔

خیرانی کی بات ہے کہ وہ فائیل چار پانچ دن سے زیادہ صدر کے
سیکرٹریٹ میں نہیں ٹھہر سکتی اسے وہاں رکے چھ مہینے گزر گئے۔ شہباز نے بعد
میں بتایا کہ پیچھے سے ریٹائرمنٹ آتے تھے اور میں انہیں گول کر جاتا تھا۔ وہ کہتا
ہے کہ میں اس معاملہ کے انتظار میں تھا جسے میں گول نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ لڑکے نے جو پھانسی کی کوٹھڑی میں تھا اپنے
باپ کو پیغام بھجوایا کہ پھانسی دینے والی کوٹھڑی کی صفائی ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر
لگتا ہے کہ صبح مجھے ہی پھانسی دی جا رہی ہے۔ یہ نشان حال باپ اسی وقت رونما
ہوا اشفاق کے مکان پر آگیا اور ساری بات روتے ہوئے بیان کی۔ اشفاق نے
اسی لمحے کراچی اپنے دوست کو فون کیا اور پوچھا کہ وہ چیز جو میں تمہارے پاس

امانت کے طور پر چھوڑ آیا تھا وہ تم نے آگے پیش کر دی ہے کہ میں؟
دوسری طرف سے شہباز نے جواب دیا۔

”تمہاری امانت میری الماری میں بند پڑی ہے۔“

اشفاق نے لڑکے سے باپ کو بتایا تو باپ نے ہاتھ پیر کر کہا۔

”خدا کے لئے اچے دوست سے کہیں کہ وہ الماری کھول کر دیکھ
آئے۔ میری تسلی ہو جائے گی۔“

اشفاق نے شہباز سے کہا۔

”یار الماری کھول کر دیکھ تو کہ میری امانت تمہاری الماری میں ہی
ہے۔“

شہباز بولا۔

”ٹھیک ہے۔ تم ہالڈ کرو۔ میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔“

اشفاق نے لڑکے کے باپ سے کہا۔

”وہ الماری کھول کر فائنل دیکھنے گیا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد اشفاق نے ویلو ویلو کیا تو دوسری طرف سے شہباز کی
آواز آئی۔

”میں دیکھ آیا ہوں یار۔ فائنل اسی طرح الماری میں بند پڑی ہے۔

مگر اب اس کا کچھ بہتہ نہیں ہے۔ رہا منڈر پر رہا منڈر آ رہے

ہیں۔ لگتا ہے یہ فائنل مجھے اب صدر کو پیش کرنی ہی پڑے گی۔“

اشفاق نے کہا۔

”جب تک دیکھ سکتے ہو اپنے پاس ہی رکھو۔ آگے اللہ ہانک ہے۔“

اشفاق نے فون بند کر دیا۔ لڑکے کا باپ اشفاق کا ہاتھ اپنی آنکھوں کے

ساتھ لگا کر چکیاں بھر کر رونے لگا۔



اب ایسا اتفاق ہوا کہ یوم پاکستان آیا۔

لڑکے کی زندگی اللہ میاں نے لکھ رکھی تھی۔ شہباز نے اس کی رحم کی
پہل کے ساتھ ایک نوٹ لکھا جس میں اس بات پر زور دیا کہ لڑکا باپ کا
قلمنا فرزند ہے۔ اپیل صدر کے پاس پیش ہوئی۔ صدر نے موت کی سزا عرقید
میں تبدیل کر دی۔ باپ کو عظم ہوا تو وہ مجھے شین گریا۔ دوڑا دوڑا اشفاق
کے گھر آیا اور دوڑ کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

اشفاق احمد کا دل اولاد کی محبت کے ہڈیے سے لہرے ہے۔ وہ دوسروں
کی اولاد سے بھی محبت کرتا ہے اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور ہمیشہ خیر کی
دعا مانگتا ہے۔

صدر ایوب کی جانب سے مغربی پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں بھی
جمہوریت ترین چلائی گئی جس میں مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی پاکستان کے
’ دانشوروں ‘ انہوں ‘ شاعروں اور صحافیوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کا
مرکزی خیال قدرت اللہ شہاب کی فکر کا نتیجہ تھا جو ان دنوں صدر ایوب کے
سیکرٹری تھے۔ پاکستان کے کوئے کوئے میں رہنے والے انہوں ‘ شاعروں ‘
’ دانشوروں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ میں بھی انہوں اور حفیظ جالندھری کے
ساتھ ڈھاکہ پہنچ گیا۔ وہاں اشفاق احمد پہلے سے موجود تھا۔ کیونکہ شین کے سفر
کے بعد ڈھاکہ میں انہوں ‘ دانشوروں کی ایک آل پاکستان کانفرنس بھی ہوئے
والی تھی جس کے انتظام و انصرام کی خاطر اشفاق احمد کچھ روز پہلے وہاں پہنچ گیا
تھا۔

ہمیں ایم پی اے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ اشفاق احمد وہاں چیف سیکرٹری کے پچھلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہماری روزانہ کی ملاقاتیں ہوتیں۔ دو روز بعد جمہوری ٹرین کا سفر شروع ہو گیا۔ یہ سفر ڈھاکہ کے کھلا پور ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا۔ اس ٹرین نے سارے مشرقی پاکستان میں جہاں جہاں ریلوے لائن لگی ہوئی تھی سفر کرتا تھا۔ ہمیں تین چار دن لگ گئے۔ راستے میں جہاں روایا آ جاتا وہاں سے ہم سمنوں میں بیٹھ کر سفر کرتے۔ ہم کاکس بازار بھی گئے۔ وہاں لہراتے ناریلوں والے گرم سمندری ساحل پر بھی لمبی لمبی سیریں کیں۔ میرے لئے پرائیویٹوں کی تنہید کا نذرانہ تھا۔ مجھے لگا کہ سمندری ساحل اور ٹکٹوں میں درپائے ہنگی کے کنارے مرطوب ہوائوں میں لہراتے ناریلوں کے درخت یاد آ رہے تھے۔ اشفاق احمد میرے ساتھ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خدا نے شاید صرف ناریل کے درختوں، جنوبی سمندروں کی موسلا دھار بارشوں اور گھنے گرم جنگلوں میں بھٹکتے بانس اور کیلے کے درختوں سے محبت کرنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ کیونکہ جب بھی میں بالکل نیوٹرل ہو کر اپنے دل کو ٹوٹا ہوں تو اس میں جنوب مشرقی سمندروں کی مرطوب ہوائوں، ان ہوائوں میں لہراتے ناریل اور کیلے کے درختوں، بانس کے جھنڈوں میں برستی بارش، پونھوار کے دھڑکے والے پھولوں، انہیں آبار کے مونیٹے کے پھولوں اور شمال مار باغ کے آم کے درختوں اور لاہور کی نیم تاریکی والی کویتوں اور سکول کو جاتی معصوم بچیوں اور لڑکا کی چائے اور اعلیٰ ترین سگریٹ کی محبت کے سوا مجھے کسی دوسری چیز کی اتنی محبت نظر نہیں آتی۔ اگر نظر آتی بھی ہے تو وہ مٹ جانے والی محبت ہوتی ہے۔ ہاتھ بندھ آکر ہاتھ سے نکل جانے والی محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ کاکس بازار کے سمندری ساحل پر جب میں اشفاق احمد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا تو میں ایک بالکل ہی مختلف آدمی تھا۔ اگر اس وقت اشفاق میرا سمندروں، جنگلوں، بارشوں، سیلون کی چائے اور قدیم قلعوں کے پرانے بانوں سے محبت کرنے والا چہرہ دیکھ سکتا تو وہ بھی سمجھتا کہ اس کے ساتھ اسے

مید کی بجائے کوئی دوسرا فضا چل رہا ہے لیکن وہ میرا یہ چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا یہ چہرہ صرف لاہور کے درخت اور رات کو آسمان پر چمکنے والے ستارے اور اعلیٰ ترین سگریٹ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یا جب کبھی میں پونھوار کے خوشبودار دیالے کھیتوں میں سے گذر رہا ہوتا ہوں اور بارش شروع ہو جاتی ہے اور بارش مجھے اپنا آئینہ دکھاتی ہے تو وہ اس آئینے میں میرا چہرہ دیکھ لیتی ہے اور بڑی خوش ہوتی ہے اور مجھ سے باتیں کرتی ہے۔

بارش میری محبوبہ ہے۔ ہم دونوں بادلوں کی چھاؤں میں جنگلوں، کھیتوں، پہاڑوں اور درختوں کے جھنڈوں میں چھپ چھپ کر لہتے ہیں۔ وہ میری زبان میں مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ میں اس کی زبان میں اس سے باتیں کرتا ہوں۔

کاکس بازار کا سمندری ساحل بڑا لمبا ہے۔ ایک جانب ناریل کے درختوں کے جھنڈ دور تک پہنچے ہیں دوسری جانب گمراہ سبز سمندر محدود لگا ہوا پھیلا ہوا ہے۔ اس سمندر میں میں سفر کر چکا ہوں۔ چار دن کا سفر تھا۔ آگے جا کر یہ سمندر گمراہیہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام کالا پانی پڑ گیا ہے۔ ہم دور تک نکل گئے تھے۔ وہاں سے واپس ہونے اور رست کا ساحل چھوڑ کر ناریلوں کے بیچے آگئے۔ ناریل کے درختوں کی چھاؤں میں بڑی خوشبودار جنوب مشرقی ایشیائی گمراہش تھی۔ یہ میری روح اور میرے جسم کا حصہ تھی۔ مجھے ناریل کے درختوں میں آکر بڑا سکون محسوس ہوا اور میں نے سگریٹ سلا گیا۔ ناریل کے درخت مجھے سگریٹ سلا کر دیکھ کر قہقہے پڑے۔

ڈھاکہ میں ہماری مصروفیت بہت زیادہ تھیں۔ پھر بھی میں اور اشفاق احمد وقت نکال کر محمد پور چلے جایا کرتے تھے۔ وہاں میرے رشتے میں بھائی شاہد رشید بیٹ، فاروق بیٹ اور ذوالفقار بیٹ کا قالیوں کا شوروم تھا۔ وہاں ہمیں گھر کی بنی ہوئی کشمیری سبز چائے بھی ملتی تھی۔

ایک روز میں اور اشفاق احمد ذوالفقار بیٹ کی گاڑی میں بیٹھ کر شاہ

شرق کی جانب شہر سے بہت دور نکل گئے۔ یہ بڑے امن امان کا زمانہ تھا۔
 ڈھاکہ سے کوئی تیس چالیس میل دور منہل کے گھنے درختوں میں شاہد بٹ
 نے ایک چھوٹا سا کالج بنوایا ہوا تھا جہاں وہ اپنی فیملی کے ساتھ پک پک مٹانے
 چلا جاتا تھا۔ یہ فکری کا بڑا خوبصورت کالج تھا۔ آگے پر آمدہ تھلہ زمین سے کوئی
 چار فٹ بلند بائیس کے بڑے بڑے ستونوں کے اوپر یہ کالج تعمیر ہوا تھا۔ ہم
 کا اُسے نیچے سے جھک کر گزر جاتے تھے۔ ایک جانب کیلے کے درخت تھے۔
 چھوٹی سی کھیتی میں انٹاس لگے تھے۔ ہم نے سارا دن وہاں گزارا۔ شام کو
 واپس آئے۔ اشفاق کو دو جگہ بڑی پسند آئی۔ کہنے لگا۔

”ایسا ایک کالج ہمیں بھی لاہور کے شور بنگارے سے دور بنانا
 چاہیے۔“
 میں نے کہا۔

”میں زمین پر تو ایسا کالج نہیں بنا سکتا۔ مگر ایسا ہی ایک کالج میں نے
 اپنے اندر بنالیا ہوا ہے۔ خوب ولی چاہتا ہے اسی کے برآمدے میں
 منہل کے درختوں کے پاس بنگرٹ سٹاک کر بیٹھ جاتا ہوں۔“
 اشفاق ہنس کر کہنے لگا۔

”تم ہر وقت رونا تک باتیں نہ کیا کو بچہ! حقیقی زندگی کی گرم لو
 چلی تو تمہارے کالج کے سارے پھول مرجھا جائیں گے۔“
 میں نے ہنس کر کہا۔

”میں تو اس کالج کی خوبصورتی ہے کہ وہاں کبھی لو نہیں چلتی اور
 اس کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے۔“

لیکن یہ تو تصوراتی باتیں ہیں۔ اشفاق ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر اسے یہ
 بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ میں حقیقت کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہوں۔
 بلکہ اس سے نوادہ حقیقت کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ جتنی گرم لو میں نے دیکھی
 ہے اس نے نہیں دیکھی۔

بھر حال ذوالفقار بٹ کے منہل اور کیلے کے درختوں والے کالج میں۔
 کچھ وقت گزار کر اسے بڑی خوشی حاصل ہوئی تھی اور میں بھی چاہتا تھا۔ اب
 ہمارا مشرقی پاکستان کا سفر شروع ہو گیا۔ اس کو جمہوریت کے سفر کا نام دیا گیا تھا۔
 نہ تو مجھے جمہوریت سے دلچسپی تھی اور نہ میں اس کے مفہوم سے واقف تھا۔
 مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں درختوں کے ساتھ جنوب مشرقی فضاؤں میں
 سفر کر رہا ہوں۔ میرے لئے یہی سب سے بڑی جمہوریت تھی۔ کئی روز تک یہ
 جمہوری ترین چلتی رہی۔ مشرق پاکستان کے سارے اہم شہر دیکھے۔ دریاؤں پر
 سے گزرے۔ جنگلوں میں سے گزرے جہاں دیودار کے درختوں کی ٹھنڈی
 خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ رائگا منی کے پہاڑی رستہ بازس کے برآمدے میں
 کھڑے ہو کر دوسری طرف نیچے بستے کرنا فلی دریا کو دیکھا۔ دریا پار سندھ بن
 کے ڈگنل کی جھلک دیکھی۔ اس ڈگنل میں درود دھاری دار شیر پائے جاتے ہیں۔
 انہیں بنگل چانگہر کہا جاتا ہے۔

سلسٹ میں ہم چائے کے باغوں میں گئے۔ پہاڑی ڈھلانوں پر چائے کے
 سرسبز پودے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آگے اور نیچے تک چلے گئے تھے۔
 کہیں کہیں عورتیں چائے کی پتیاں چتی نظر آ رہی تھیں۔ یہاں بارگ کے فہر
 نے مجھے چائے کا ایک ٹیکٹ دیا۔ کہنے لگا۔

”یہ خاص چائے ہے۔ اس میں رنگ نہیں ملایا گیا اور اسے
 Blend بھی نہیں کیا گیا۔ یہ بالکل اصلی چائے ہے اور ہم یہ چائے
 خاص خاص مہمانوں اور چائے کے شوقین لوگوں کو دیتے ہیں۔“
 سلسٹ میں ہم ایک کارخانہ دار میٹھے کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔
 اشفاق تو کسی دوسری جگہ پر ٹھہرا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

”مہمان کی چائے تم میرے ساتھ ہی پینا۔ میں یہ خاص چائے
 تمہارے ساتھ پینا چاہتا ہوں۔“
 ہم تھوڑی دیر سلسٹ ریلوے سٹیشن پر اپنی جمہوریت ٹرین میں رہے۔

پھر میں اشفاق کو لے کر اس کو بھی میں آگیا جہاں مجھے اور ابن انشاء کو ایک چھوٹا سا بندہ روم دے دیا گیا تھا۔ میں نے نوکر سے کہہ کر کھانسی منگوائی تو ایساں منگوائیں۔ پھر اسے گرم پانی لانے کو کہا۔ میں نے ٹیکٹ کھول کر چائے کی خوشبو سو گھنٹی۔ یہ عجیب سرسبز قسم کی خوشبو تھی۔ میں نے چائے کے دو چمچ کھانسی میں ڈال دیئے۔ نوکر گرم پانی لایا تو اس میں گرم پانی ڈال کر کافی کوزی سے بند کر دیا۔ پورے دس منٹ بعد کھانسی میں سے چائے پالیوں میں ڈالی تو ایسا معلوم ہوا جیسے طلوع ہوتے سورج کی کرنوں نے چائے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر دونوں نے بڑے اہتمام سے اس کا ایک ایک گھونٹ پی کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 اشفاق نے بھنٹ میں سکیڑ کر کہا۔
 ”یہ چائے میری سمجھ میں نہیں آئی۔“
 چائے میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ مگر آخر وہ چائے تھی اور اصلی چائے تھی۔ دراصل ہمیں انگریزوں نے Blend کی ہوئی چائے کی عادت ڈال دی تھی۔ ہمارا چائے کامزاج انگریزوں کا بنایا ہوا ہے۔ بہر حال مجھے اس چائے میں کم از کم چائے کے باغوں کی محک ضرور مل گئی تھی۔
 ہماری لاہور داہی کی تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں کہ مشرقی پاکستان کے شاعر نسیم الدین نے تمام انبجوں، شاعروں اور دانشوروں کو اپنے ہاں دعوت پر بلالیا۔ قری نسیم الدین کے گھر کے آگے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں ایک کشتی نہ جانے کب سے اونٹھی پڑی تھی۔ مکان کے دروازے پر ایک چھوٹی معصوم بچی چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی چٹخیر لٹے کھڑی تھی۔ وہ ہر مسمان کا استقبال چنبیلی کا ہار اس کے گلے میں ڈال کر کرتی۔ ہمیں یہ معصوم استقبال بڑا اچھا لگا۔ قری نسیم الدین بڑی گر بخوشی کے ساتھ ہر مسمان سے مدد لے کر رہا تھا۔ کھانے میں اس نے بنگال کی خاص ڈش وال بھلت اور کبیر

کی تھی دو بے مد لذیذ تھی۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا اور پھر گانے بانے کی محفل شروع ہو گئی۔ نسیم الدین نے ایک سکول کے میوزیکل گروپ بلا دیا ہوا تھا۔ ان میں ایک دسویں جماعت کی ایک لڑکی بھی تھی جس کا نام مرزا تھا۔ یہ لڑکی بعد میں ختم کے نام سے بطور قلم اکٹھریں بڑی مشہور ہوئی۔ یہ دقت یہ لڑکی تھی اور اس نے بڑے کمال کا رقص کیا۔

کافی دیر تک جگے جگے کی یہ محفل جاری رہی۔ پھر ہم لوگ اپنے اپنے کھانکوں پر آگئے۔ اس نے اگلے روز دھاکے میں ہماری مصروفیات ختم دیکھیں۔ اور ہماری داہی کا سفر شروع ہو گیا۔ میں اور ابن انشاء ایک ہی جہاز میں دھاکے سے کراچی پہنچے۔ وہ کراچی میں حق ربک گیا۔ میں دوسرے روز پور پہنچ گیا۔

اب میں آپ کو اشفاق احمد کا ایک اور واقعہ بتاتا ہوں۔ یہ وہ واقعہ ہے جسے میں نے کب تک نہ تو کسی کو بتایا ہے اور نہ اس کا ذکر کسی کتاب میں لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشفاق نے مجھے منع کر رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس واقعے کی تشہیر ہو۔ اس نے ایک ٹکٹی کی تھی اور اسے دریا میں ڈال دیا تھا۔ آج میں یہ واقعہ دریا میں سے نکال کر آپ کے لئے یہاں قلم بند کر رہا ہوں۔ یقین کریں اس کے لئے میں نے اشفاق سے کوئی اجازت نہیں لی۔ وہ کراچہ سے ناراض ہو گا تو میں اسے سنبھال لوں گا۔

راکل پارک میں ایک قلم سنبھلی کا دفتر ہوا کرتا تھا جس کا ایک تہ خانہ بھی تھا۔ رات کو اس تہ خانے میں بیٹے کر کچھ دوست پڑ پڑا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی اس محفل میں شریک ہو جاتا تھا۔ یہ سب آپس میں بے تکلف دوست تھے اور تقریباً سب کا تعلق قلم اور آرٹ کی دنیا سے تھا اور سب بچتے عمر کے دسے دار لوگ تھے۔ ان کی اشرفی صرف اتنی تھی کہ وہ بھر کی دوڑ وچ کی تھکان اٹارنے کے لئے مل بیٹھے اور بے محاذ کا لطف اٹھاتے۔ یہاں کبھی کوئی دھکم نہیں ہوا تھا۔ کبھی دھکم چوکھی نہیں لگی تھی اور اس قسم

کے باہل کا تقاضا تھا۔ زیادہ تر یہ لوگ فلموں یا فلم کی کمپنیوں اور آرٹ کی باتیں کرتے۔ اگر کسی کو زیادہ چڑھ جاتی تو وہ اجازت لے کر وہاں سے چل دیتا۔ کسی غیر آدمی کو وہاں آنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ ایک رات ایسا ہوا کہ اس منڈی میں بیٹھے والا ایک آدمی اپنے کسی دوست کو ساتھ لے آیا۔ اس دوست کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس نے یہی جانا کہ یہ لڑکی کراچی میں ماڈلنگ کرتی ہے اور اس کے ساتھ وہ شادی کرنے والا ہے۔ سب کا مود آف ہو گیا۔ کیونکہ وہاں کبھی کوئی عورت نہیں آتی تھی۔ بہر حال محفل شروع ہوئی۔

لڑکی نے نہ باری برقعہ پہن رکھا تھا۔ چہرے کا نقاب ہٹا ہوا تھا۔ ساقوں کی معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی اور وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ آہستہ آہستہ محفل گرم ہوتی گئی۔ باتوں میں گرمجوشی آگئی۔ جو آدمی لڑکی کو ساتھ لایا تھا اس نے لڑکی کے ساتھ بے تکلف ہو کر شروع کر دیا۔ لڑکی بار بار مسکتی جاتی تھی۔ جس آدمی کا وہ دفتر تھا اس کو یہ بات سخت ناگوار لگی۔ اس نے کہا۔

”بھائی جان! یہ ٹھیک ہے کہ یہ آپ کی منگیت ہے مگر میں آپ کو

یہاں اس قسم کی حرکتوں کی اجازت نہیں دوں گا۔“

جو آدمی اس شخص کو اپنے ساتھ لایا تھا اس نے فوراً اپنی طرف سے معذرت پیش کی اور اپنے دوست سے کہا۔

”یار! تم اپنا ہونے والی بیوی کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلے

جاؤ۔ جاؤ۔“

وہ شخص فوراً لڑکی کو بازو سے سمیٹتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ تھوڑی سی دیر بعد دوسرے کمرے سے لڑکی کے پیچھے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

”مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ! یہ مجھے مار رہے ہیں۔“

ہم بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ اس آدمی نے لڑکی کو زمین پر کر لیا ہوا ہے۔ ہاتھ میں چاقو ہے اور اسے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب نے فوراً آدمی کو قابو کر کے اس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔ لڑکی کے حواس گم تھے۔ وہ کونے میں کئی چھٹی چھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص بار بار کہہ رہا تھا۔

”تم کون ہوتے ہو ہمارے محلے میں دخل دینے والے۔ چھوڑ دو

مجھے۔ میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں پورے پانچ سو روپے دے کر اسے لایا ہوں۔ یہ کیا سمجھتی ہے۔“

اس شخص کی سب نے ٹھکانی کی۔ دفتر کے مالک نے اسے حکم دیا۔

”ابھی یہاں سے نکل جاؤ نہیں تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”میں اس عورت کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

لڑکی نے چیخ کر کہا۔

”تھرا کے لئے مجھے اس کے ساتھ نہ بھیجیں۔ یہ مجھے قتل کر دے

گا۔“

اس محفل میں بیٹھے والے جس شخص کے توسط سے وہ آدمی وہاں لڑکی

کو لے کر آیا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گالی

دے کر کہا۔

”بندے کے پتر ہو تو اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ نہیں تو میں خود

تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔“

وہ آدمی بڑبڑاتا دھمکیاں دیتا وہاں سے چلا گیا۔ لڑکی اس کمرے میں

سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ سب کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب اس لڑکی

کا کیا کیا جائے۔ یہ لوگ کاروباری قسم کے شریف لوگ تھے۔ سب گھبرایا

والے تھے۔ رات کو محفل تھوڑی سی تفریح کے لئے وہاں بیٹھ جاتے تھے۔

سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ لڑکی کا کیا کریں؟ لڑکی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میزا پر سے کوئی نہیں ہے۔ یہ شخص مجھے چنڑی کے ایک گاؤں سے ہلا پھسلا کر لے آیا تھا۔ میں اس کے ہرکانے میں آگئی۔ کسی نے کہا۔

”اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ وہ اسے خود اس کے جکوں پہنچا دے گی۔“

کمی نے کہا۔

”یہ غلطی مت کرنا۔ اگر لڑکی جیسا کہ وہ کہہ رہی ہے اگر کسی شریف گھرانے کی ہے تو قتلے بھی تو داغ لگ جائے گا۔“

”تو پھر اسے کہاں پہنچایا جائے؟“

سب کے ذہن میں یہی ایک سوال تھا۔ کوئی بھی اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے اور پھر اس کے گاؤں پہنچانے پر تیار نہیں تھا۔ سب بال بچے دار تھے اور پھر یہ بھی خیال تھا کہ ہو سکتا ہے لڑکی جھوٹ بول رہی ہو۔ یہ کوئی بیٹہ ویر آوارہ عورت ہو۔ خواہ مخواہ کی بدنامی مول لینے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ اگرچہ میری دو سال پہلے شادی ہو چکی تھی۔ میں نے دفتر کے مالک سے کہا۔

”اس کو میں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔ صبح اسے لے کر اس کے گاؤں چلا جاؤں گا۔“

سب کے ذہن سے جیسے بوجھ سا اثر گیا۔ سب خود راضی ہو گئے۔ یہ ٹھیک ہے۔ بس تم اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ اپنی طرف سے ہر کوئی اس لڑکی کی بلا میرے سر ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہے؟ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”پہلی چلوں گی۔ مگر خدا کے واسطے مجھے میرے گھر ضرور پہنچا دے گا۔“

مجھے بھی تھوڑی تھوڑی چڑھی ہوئی تھی۔ تمہ خانے کی گرما گرمی اور

ہدایت میں آکر میں نے لڑکی کی زبرداری تو قبول کر لی تھی لیکن جب آدھی رات کے وقت اسے لے کر قہر خانے سے باہر نکالا اور باہر کی ٹھنڈی ہوا لگی تو کچھ ہوش آ گیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس لڑکی کو گھر لے کر کیا تو بیوی کیا کہے گی؟ اور ادھر سے میں نے تھوڑی سی بھی رکھی ہے۔ عام طور پر میں نشہ ہرن ہونے کے بعد گھر کا رخ کرتا تھا۔ تاکہ گھر میں کسی کو نہ نہ چلے اور گھر میں نہ ہی سو جایا کرتا تھا۔

دل میں یہ خیال بھی بار بار آتا کہ ہو سکتا ہے لڑکی جھوٹ بول رہی ہو اور اس کا تعلق کسی پیشہ ور گروہ سے ہو۔ سردیوں کا موسم تھا۔ راتل پارک کا علاقہ سستان تھا۔ میں نے لڑکی کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا۔

”دیکھو بی بی! میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں لیکن میں عورت کی عزت کی قیمت کو جانتا ہوں۔ مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم اصل میں کہاں سے آئی ہو اور اس آدمی کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔“

لڑکی رونے لگی۔

”مجھ سے قسم لے لو۔ میں غریب لڑکی ہوں میں کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ یہ آدمی مجھے دھوکے سے لے آیا ہے۔ تم مجھ اپنے گھر لے چلو۔ میں تمہیں سارا قصہ بتا دوں گی۔ خدا کے واسطے مجھے قہر خانے سے لے جانا۔ میرے بوڑھے باپ کو پیچ چلا تو وہ وہیں مر جائے گا اسے پہلے ہی تلخ ہوا ہوا ہے۔“

تب میں نے سوچا کہ اب اس لڑکی کا ہاتھ کچڑا ہے تو اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ لڑکی پر اعتبار کرو اور ”تمے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں بڑا چڑباتی ہو گیا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“

میں نے اسے ساتھ لے کر کشمی چوک میں آگیا۔ اس زمانے میں رکنا وغیرہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ ٹیکسی بھی بڑی مشکل سے نظر آتی تھی۔ میں نے

تاکہ لیا اور اسے ساتھ بٹھا کر اپنے گھر کی طرف جانے کی بجائے اشفاق کے گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ خیال اچانک میرے دماغ میں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اشفاق اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کر لے گا۔ میں نے اس کا ایک خالی گیم راج دیکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ لڑکی کو رات اس گیم راج میں ملا دیں گے۔ اسی رات گزر چکی تھی۔ میٹرو روڈ خالی خالی تھی۔ تاکہ اشفاق کے پہلے والے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

آرہا کھنڈے لگ گیا۔ میں نے تاکتے کو ذرا پیچھے ایک درخت کے نیچے کھڑا کیا اور اتر کر اشفاق احمد کے گھر کی طرف بیدھا۔ اس کے برآمدے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر کمرے میں ادھر صیرا تھا۔ میں نے کھنٹی بجائی۔ کافی دیر بعد نوکر نے دروازہ کھولا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے اشفاق کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”جی وہ سو رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں نہیں جگا دو اور میرا نام بتاؤ۔“
نوکر چلا گیا۔ چھ سات منٹ گزر گئے۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ اس بار اشفاق گرم چادر کی بھل مارتے باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔
”خیر تو ہے۔ تم اس وقت؟“
میں نے کہا۔

”ادھر آ جاؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔“
میں اسے مکان کی دیوار کے پاس لے گیا اور جلدی جلدی سارا قصہ کہانی بیان کر دی۔ اشفاق قبور سے منٹا رہا۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ بولا۔

”تم بیسے احمق ہو۔ نواخواہ مجھے بھی کسی مصیبت میں پھنساؤ گے۔ اس لڑکی کو سیدھا تھانے لے جاؤ اور پولیس کے حوالے کر کے اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔“
میں نے کہا۔

”اشفاق میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ لڑکی شریف ہے۔ میں نے بہت پیشہ ور عورتیں دیکھی ہوئی ہیں۔ میں ان کی چال پہچان لیتا ہوں۔ یہ لڑکی ایسی نہیں ہے۔ اگر اس وقت ہم نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو کل یہ ضرور پیشہ ور عورت بن جائے گی۔ قدرت شاید اسی لئے اسے ہمارے پاس لے آئی ہے کہ وہ اسے گناہ کی دلدل میں گرنے سے پہچان چاہتی ہے۔“

اشفاق پر کچھ میری باتوں کا اثر ہوا اور کچھ اس کی فطری انسانی ہمدردی درجہ دہلی بیدار ہو گئی۔ کہنے لگا۔
”تو پھر تم کیا مشورہ دیتے ہو؟“
میں نے کہا۔

”میرا پروگرام یہ ہے کہ لڑکی کو رات تمہارے مکان کے گیم راج میں ملا دیتے ہیں۔ صبح اسے لے کر پڈی روانہ ہو جائیں گے اور جس کی یہ امانت ہے اس کے حوالے کر کے واپس آ جائیں گے۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا ہو گا۔ کیونکہ تم مدد آوی گئے ہو اور تم بڑی اچھی طرح بات کر لیتے ہو۔“

اشفاق ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ لڑکی کو تاکنے میں سے اٹھ کر لے آیا۔ نفل نے برآمدے والے بلب کی روشنی میں لڑکی کے ویران ویران چہرے کو دیکھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ لڑکی پریشانی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔
”آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں گے؟ میں ساری عمر آپ کو دعاؤں دی جی رہی ہوں گی۔“
میں نے اسے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ رات تم اس جگہ آرام سے سو جاؤ۔ صبح میں اور میرا دوست ہم دونوں تمہیں بس میں بٹھا کر تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔“

اشفاق نے اندر سے کیراج کا دروازہ کھول دیا۔ کیراج میں ایک چارپائی پہلے سے بچھی ہوئی تھی۔ ابھی اشفاق کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ ہم نے لڑکی کو چارپائی پر آرام کرنے کے لئے کھانا اور خود باہر آگئے۔ اشفاق کہنے لگا۔

"تم اس وقت کہاں گھر جاؤ گے۔ تم بھی یہاں ڈرائیونگ روم میں سو جاؤ۔ میں تمہیں کھیل لاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں بھی بیٹیس سو جاتا ہوں۔ صبح تمہارے نوکر کے ہاتھ گھر بنام بھجوا دوں گا کہ مجھے ضروری کام سے اچانک شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔"

میں نے بھی رات اشفاق کے گھر میں گزار دی۔

صبح اٹھ کر ہم نے ناشتہ کیا۔ لڑکی کو بھی ناشتہ کرایا اور پھر میں اور اشفاق اسے لے کر چنڈی جانے والی بسوں کے اوڑے پر آگئے۔ یہاں سے جو پہلی بس ملی اس میں بیٹھے اور بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ بس راڈ لینڈی چننی تو شام گھری ہوئے لگی تھی۔ دن ڈوب چکا تھا۔ لڑکی نے اپنا نام شمیم بتایا تھا۔ شمیم کا گاؤں وہاں سے بیچاس میل دور تھا۔ بس اوڑے پر دم لے جائے وغیرہ پانی اور پھر وہ سری بس پکڑ کر شمیم کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ کچی سڑک تھی۔ بس کی رفتار کم تھی۔ دو گھنٹے نہیں وہاں پہنچتے ہوئے لگ گئے۔ شمیم نے بس سے اترتے ہی ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ان درختوں کے پاس ہمارا گاؤں ہے۔"

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ ایک چمک ڈنڈی کچیتوں میں سے گذرتی ان درختوں کی طرف چلی گئی تھی۔ جس کی طرف لڑکی نے اشارہ کیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے چمک ڈنڈی پر چل رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکی کچھ گھبرائی گھبرائی سی ہے اور مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے

اس سے پوچھ لی کہ کیا بات ہے۔ اب تم کیوں پریشان ہو؟ اب تو ہم تمہیں تمہارے گھر لے آئے ہیں۔ لڑکی رک گئی۔ اشفاق بھی رک گیا۔

لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مجھے معاف کر دینا۔ میں نے یہ بات تمہیں پہلے نہیں بتائی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم مجھے میری حالت پر نہ چھوڑ دو۔"

"کیا بات ہے؟ کھل کر بتاؤ۔" اشفاق نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو پھٹکنے لگے۔ کہنے لگی۔

"میری ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ میرے باپ کو فالج ہو گیا ہوا ہے۔ وہ بستر پر سے اٹھ بھی نہیں سکتا۔ میرے باپ کا ایک سوتلا بھائی ہے۔ وہ گاؤں کا بد معاش ہے۔ شراب بنا کر بیچتا ہے۔ وہ مجھ سے ناجائز وعدہ کرانا چاہتا ہے۔ اسی نے مجھے اس آوی کے ہاتھ پانچ سو روپے لے کر بھیجا تھا مگر وہ آوی مجھے ہرلا پھسلا کر لاہور لے گیا۔"

"تم کتنا کیا چاہتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

لڑکی بولی۔

"میں یہ کتنا چاہتی ہوں کہ میرے باپ کا سوتلا بھائی یہاں کا بد معاش ہے۔ وہ دو قتل بھی کر چکا ہے۔ اسے پتہ چل گیا کہ میں انہی ہوں تو وہ مجھے گھر سے زبردستی اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے جائے گا۔ میرا بھائی باپ تو اس کا ہاتھ بھی نہ پکڑ سکے گا۔ تم دونوں میرے لئے فرشتے بن کر اترے ہو۔ تم نے میری عزت بچائی ہے تو اب مجھے اس بد معاش سے بھی کسی طرح بچا لو۔ نہیں تو میری ساری زندگی ہرلا ہو جائے گی۔"

اشفاق نے کہا۔

"بی بی! یہ تمہارے گھر بلا بھگڑے ہیں ہم اس میں دخل نہیں دیتا

چاہتے۔ ہمارا کام تمہیں گناہ کی زندگی سے بچا کر تمہارے باپ کے پاس بچانا تھا۔ سو ہم نے بچنا دیا۔
 لڑکی نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔
 ”خدا کے لئے مجھے اس بد معاش سے بچالو۔“
 ”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔
 لڑکی بولی۔

”تم میری شادی کرم داد سے کروا دو۔ بس پھر وہ بد معاش میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”یہ کرم داد کون ہے؟“ اشفاق نے پوچھا۔

”ہماری برادری کا ہے۔ چنڈی میں رکشا چلاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس بد معاش نے کرم داد کو کد رکھا ہے کہ اگر تم نے شیم سے شادی کا نام لیا تو تمہارے ٹوٹے کروسیجے چاکس گے۔“
 اشفاق بولا۔ ”تو وہ تو اس کے ٹوٹے کر دے گا۔“
 لڑکی نے اشفاق کا بازو پکڑ لیا۔

”سو بہن کر مجھے یہاں میرے باپ کے پاس لائے ہو۔ اب کرم داد سے میرا بیاہ بھی کرا دو۔ آگے جو ہو گا میں دیکھ لوں گی۔ تمہارے پاس مدد مانگتے نہیں آؤں گی۔“

اشفاق کا چہرہ تانے کی طرح روشن ہو گیا۔ وہ تین سیکنڈ وہ چپ رہا۔ پھر گہری آواز میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر تمہارا باپ اس بیاہ پر راضی ہے تو میں اور میرا دوست ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں اور یہاں سے تمہارا بیاہ کروا کر حق دالیں جائیں گے۔“

لڑکی کا چہرہ مکمل اٹھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”بھادر مائی کے لال ہو۔ آؤ میرے باپ سے ملو۔“

اس کا باپ بوسیدہ سے کواٹر نما مکان کے کمرے کے کونے میں لحاف دون تک کئے بالکل میدھا چڑا تھا۔ وہ صرف گردن بلا نکلتا تھا۔ اپنی بیٹی کو بھانپ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لڑکی نے باپ کا ہاتھ چوم لیا اور اس سے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان بیان کر دی۔ ہم نے اس کے پ سے پوچھا کہ کیا وہ اپنی بیٹی کا بیاہ کرم داد سے کرتے پر راضی ہے؟ باپ نے نچیت آواز میں کہا۔

”میں راضی میرا خدا راضی۔“



شیم کے باپ کا دوبارہ معاش کا سہارا ملا تھا اس کا نام تو کچھ اور تھا آپ اسے کالیا کہہ لیں۔ شیم کے باپ نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا کہ کالیا اس کی بیٹی اور کرم داؤ کی جان لے لے گا۔ اشفاق نے کہا۔

”ہم اسے سنبھال لیں گے۔ آپ کرم داؤ کو بلائیں۔ مولوی صاحب کو بلائیں۔ اپنے دو ایک بزرگ محلے داروں کو بلائیں اور لڑکی کا نکاح پرہیز کر دیتے کریں۔“

اشفاق کی باتوں سے شیم کے باپ کو حوصلہ ہو گیا۔ رات ہم نے اسی کواٹر میں بسر کی۔ دوسرے دن شیم نے اپنے ایک ماسوں کو بلا لیا۔ ماسوں نے سارا بندوبست کر دیا۔ ابھی تک کالے پدمعاش کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کو شیم کا نکاح کرم داؤ کے ساتھ ہو گیا اور اس نے اسی گھر میں اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ کرم داؤ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ کرم داؤ بڑا دلیر لودھان ثابت ہوا۔ اسی نے لڑکی کے باپ سے کہا۔

”ابا! تم بالکل نہ گھبراؤ، کالے کی جرات نہیں ہے کہ وہ ہمارا کچھ لگاڑ سکے۔ میں نے بھی چھڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔“

لیکن یہ لڑائی جھگڑے کی بات تھی اور وہاں خون خرابے کا شدید خطرہ تھا۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”ہمیں دونوں میاں بیوی کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرنا

چاہیے۔“

اشفاق کہنے لگا۔

”میں اپنا انتظام کر کے جاؤں گا کہ کالیا روزائیاں آکر شیم سے

پوچھا کرے گا۔ باقی کوئی خدمت ہو تو جائیں۔“

مجھے معلوم تھا کہ اشفاق ایسا کر سکتا ہے۔ اضران بالا میں اس کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ وہاں گاؤں میں ایک چھوٹا سا پوسٹ آفس تھا۔ اشفاق مجھے ساتھ لے کر پوسٹ آفس آیا۔ یہاں ایک ٹیلی فون موجود تھا۔ اشفاق نے پوسٹ ماسٹر کی اجازت سے چنڈی پولیس ہیڈ کواٹر میں کسی خاں صاحب کو فون کیا۔ خوش قسمتی سے وہ مل گئے۔ اشفاق نے کہا۔

”کیا حال ہے یار؟ میں اشفاق احمد بول رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ میں

لاہور سے نہیں پنڈی سے بول رہا ہوں۔“

پھر اشفاق احمد نے اپنے دوست کو جو پولیس کا بیڈا اضران تھا۔ اس گاؤں کا حدود اربعہ بتایا اور ساری کمائی بیان کر دی۔ پوسٹ ماسٹر رچرچ کر کے اشفاق کی طرف رکتے لگا۔ اشفاق کہہ رہا تھا۔

”جتنی جلدی پہنچ سکتے ہو پہنچ جاؤ۔ میں یہاں پوسٹ آفس کے باہر

تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ بس آجاؤ۔ یہ بڑا ٹیک کام ہے۔“

اشفاق نے ہتے ہوئے خدا حافظ کہا اور فون بند کر کے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے فوجی لمبے میں بولا۔

”یارے! فکر نہیں۔ کلک آ رہی ہے۔“

ہمیں اندازہ تھا کہ پنڈی سے اشفاق کا دوست پولیس وین میں فل پیڈ پر بھی آیا تو ایک گھنٹہ اسے ضرور لگ جائے گا۔ اتنی دیر ہم پوسٹ آفس کے باہر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”چلا! شیم کے ہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ اس کے خاوند اور باپ کو بھی

تسلی دیجئے۔“

ہم شیم کے گھر آ گئے۔ اشفاق نے ساری بات یون کی اور کہا کہ انہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سارا بندوبست کر

دیا ہے۔ میرا دوست غلام اس سارے علاقے کا انچارج ہے وہ تمہارے ساتھ کبھی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دے گا۔ تم لوگ امن چین سے ذہنی گزارو گے۔ کرم داد اور خیم اور اس کا باپ بڑے خوش ہوئے۔

اس دوران کالیے بد معاش کو خبر مل گئی تھی کہ خیم کا کرم داد سے نکاح ہو گیا ہے۔ ہم لوگ خیم کے گھر میں ہی بیٹھے تھے کہ وہ اپنے چھ سات بد معاشوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ آتے ہی اس نے پستول سے دو تین ہوائی فائر کر دیئے۔ کرم داد خوش میں آکر بولا۔

”یہ کالیہ ہی ہو سکتا ہے۔ ابھی جا کر میں اس کی بد معاشی نکال دوں۔“

اشفاق نے اور خیم نے اسے پکڑ لیا۔

”کرم داد! بد وقتی ست کرو۔ امن چین سے یہاں بیٹھے رہو۔ دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے۔“

کالیے بد معاش نے باہر سے لٹکارتا شروع کر دیا۔ بھر وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس کے ساتھی باہر ہی حکم کے منتظر کھڑے رہے۔ یہ کالیہ اچھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ شکل ہی سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔ اس نے میری اور اشفاق کی طرف دیکھا اور بولا۔

”تم لوگ اس کے تباہی بن کے آئے ہو۔ میں تم سے بھی نفرت کروں گا۔ پہلے اس بڑھے کی تو خبر لے لوں۔“

کرم داد کھڑا ہو گیا اور کڑک کر بولا۔

”کالیے! خدا کا خوف کرو۔ اگر تو نے کسی کو ہاتھ لگایا تو یاد رکھو یہاں سے تو بھی زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔“

کالیے نے دانت چرس کر کہا۔

”جھپٹیں بھی دیکھ لوں گا۔“

اب اشفاق بچ میں آ گیا۔ اس نے بڑی جھل مندی اور جوش عیاں سے

کام لیتے ہوئے کالیے کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے۔ کرم داد اور خیم میاں بیوی ہیں اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو قانون کے قہقہے سے نہیں بچ سکتے گا۔ ساتھ ساتھ اشفاق احمد کالیے کو نرم لمحے میں سمجھاتا بھی جا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ وقت گزار رہا ہے تاکہ اتنی دیر میں اس کا پولیس افسر دوست وہاں پہنچ جائے۔

اتنی دیر میں اشفاق کا پولیس انسپکٹر دوست پولیس کی پوری گارڈ لے کر پوسٹ آفس پہنچ گیا۔ اس نے اشفاق کو وہاں نہ دیکھا تو پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔ پوسٹ ماسٹر نے کہا کہ وہ گاؤں کی طرف سے آئے تھے۔ اس دوران کالیے کے ساتھیوں نے جو مکان کے باہر کھڑے تھے اشتغال میں آ کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اب پولیس کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پولیس انسپکٹر نے پستول نکال لیا اور جس طرف فائرنگ ہو رہی تھی اُدھر کو پولیس کی گارڈ لے کر دوڑا۔ اشفاق نے باہر گاڑی رکنے کی آواز سنی تو جلدی سے باہر نکل آیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ باہر پولیس کی پوری مسلح گارڈ نے کالیے کے ساتھی بد معاشوں سے ہتھیار رکھا کر انہیں حراست میں لے لیا تھا۔ اشفاق کا دوست بولا۔

”نکال ہے ان کا سرخند۔“

اشفاق نے انشائی رائٹمنڈی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔“

مگر پولیس مکان کے اندر آ گئی۔ کیونکہ کالیہ پستول لے کرے میں موجود تھا اور پولیس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے کالیے سے کہا۔

”پستول مجھے دے دو۔“

اور آگے بڑھ کر اس نے کالیے کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ پھر اسے دھکا دے کر کمرے سے باہر گرا دیا اور پولیس سے کہا۔

”لے چلو اسے۔ اس کی بد معاشی نکالتے ہیں۔“

اشفاق نے پولیس انسپکٹر کا عظیم کرم داد اور عظیم کے چار باپ سے
تعارف کروایا اور پوری تفصیل سے سارا قصہ سنایا۔ پولیس انسپکٹر نے جس کو
اشفاق خان کہہ رہا تھا گھر والوں کو پوری تسلی دی اور کہنا۔

”میرے ہونے ہوئے یہاں کوئی بد معاش قانون کو اپنے ہاتھ میں
نہیں لے سکتا۔ آپ آرام سے رہیں۔ اپنا کاروبار کریں۔ میں ان
بد معاشوں کو ہانک سیدھا کر دوں گا۔“

یہ بات میں یہاں جانا بھول گیا ہوں کہ نکاح ٹائے پر لڑکی کی طرف سے
اشفاق احمد نے بطور وکیل دستخط کئے تھے۔ میں نے گواہ بن کر دستخط کئے۔
پولیس انسپکٹر کالیے اور اس کے ساتھی بد معاشوں کو گرفتار کر کے لے
گئی۔ دارا ابراہن تھا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے لاہور کی طرف
روانہ ہو جائیں۔ گھر لڑکی نے کہنا۔

”بھائی جان! ابھی نہ جائیں میرا دل نہیں مانتا۔ آج کی رات وہ
جائیں میں آپ کا احسان ساری زندگی میں بھولیوں گی۔“
میں نے اشفاق سے کہنا۔

”یار! جہاں ایک رات گزار دی ہے۔ وہاں دو سہ رات بھی گزار
دیتے ہیں۔ لڑکی کی تسلی ہو جائے گی۔“

میں نے وہ رات بھی وہیں بسر کی۔ وہ سہ دن ہم جنوری مروفی انور کھن
کا مانتہ کر کے فارغ ہوئے تھے کہ باہر گاڑی کی آواز آئی۔ اشفاق نے
دروازے کی طرف دیکھا اور کہنا۔

”شاید میرا چار خان آیا ہے۔“

عظیم اور کرم داد دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے میں دروازے پر
کسی نے دستک دی۔ کرم داد نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر پولیس کے چار
سپاہی کالیے بد معاش کو لے کر کھڑے تھے کالیے نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔
مجھے ہی دروازہ کھلا کالیا اندر آیا اور سیدھا لڑکی کے باپ کی چارپائی کی

طرف گیا اور اس کے پاؤں پر سر رکھ کر روتے ہوئے بولا۔

”بھائی! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بڑے دکھ پہنچائے ہیں۔
خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ میں اب کبھی تمہیں دکھ نہیں
دوں گا۔“

اس کے بعد اس نے عظیم کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔
”بھئی! تم بھی مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو خدا
بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔“

اسی طرح اس نے کرم داد سے بھی معافی مانگی اور اس کو اپنے گلے سے
لٹالیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ کالیے بد معاش کی ایک آنکھ تھوڑی سوجی ہوئی
تھی۔ اشفاق کے پولیس انسپکٹر دوست نے کالیے کو بالکل سیدھا کر دیا تھا۔ عظیم
کرم داد اور اس کے سرسرنے کالیے کو معاف کر دیا۔ کالیا پھر ہم سے معافیاں
منگنے لگا۔ اس نے اشفاق کی طرف دیکھا اور بڑی عاجزی سے بولا۔

”میری ایک عرض ہے حضور! خان صاحب سے کہیں کہ وہ بھی مجھے
معاف کر دیں اور مجھے پنڈی تھانے میں نہ بلائیں۔“
اشفاق نے کہنا۔

”جب تم نے برائی سے توبہ کر لی ہے اور عہد کر لیا ہے کہ آئندہ تم
شریف آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرو گے تو پھر خان کو کیا ضرورت
ہے تمہیں تھانے بلائے گی؟“
کالیا گردن خمی میں ہلانے لگا۔

”حضور! آپ نہیں جانتے۔ آپ نہیں جانتے“ خان صاحب سے کہ
کر تھانے سے میری جان بخشی کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کا
غلام بن کر رہوں گا۔“

اشفاق نے پڑا۔

”مگر تمہیں کرو۔ میں خان کو کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں آئندہ تھانے

”میں بلائے گا مگر تم بھی اپنے عہد پر قائم رہنا اور شریف بن کر رہنا۔“

کالے بد معاش نے کانٹوں کو ہاتھ لگائے اور کہا۔

”میری توبہ میرے باپ کی بھی توبہ میں نے آج سے سب سے دھندے چھوڑ دی ہے۔“

بھروسہ لڑکی کے باپ کی پانچویں کے پاس فرش پر بیٹھ گیا اور اس کے لالچ زور پاؤں دبانے لگا۔

اسی روز میں اور اشفاق لاہور کے لئے واپس روانہ ہو گئے۔ گاؤں کے لاری اٹنے پر چھوڑنے کرم دادا، عظیم اور کالیا بد معاش بھی تیار۔ اس نے سر پر حاجیوں والا زرد رومال باندھ رکھا تھا۔ اشفاق نے اور میں نے سب سے مصافحہ کیا۔ اشفاق نے عظیم اور کرم دادا کو آپس میں محبت پیار سے رہنے کی تلقین کی اور ہم لاری میں بیٹھ گئے لاری ہمیں لے کر غڈی کی طرف چل چڑی۔

میں نے اشفاق سے کہا۔

”اشفاق تم نے یہ بڑا عمدہ سٹیک کام کیا ہے۔ میں بڑا متاثر ہوا ہوں۔“

اشفاق احمد شرمیل سی سکر ایٹ کے ساتھ بولا۔

”نہیں یار! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ تم نے کہا تو میں نے سوچا کہ ایک شریف بی بی کی زندگی سنو سکتی ہے۔ تو اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔“

میں نے کہا۔

”بھر بھی یار کون اپنے گھر کا میٹھ آرام چھوڑ کر ایک غریب لڑکی کی خاطر سر پیوں میں آتا سڑ کر کے آتا ہے اور جبکہ معاملہ بھی سنگین نوعیت کا ہو۔“

اشفاق بولا۔

”یار! ایسے کالیا بالکل سیدھا ہو گیا ہے۔ میرے یار خان نے اس کی بڑی کارگر لٹھکائی کی ہے۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ان لوگوں سے ایسا ہی ملوک کیا جائے تو یہ راہ راست پر آتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”بھر بھی میں کہوں گا کہ کالے کو خدا نے بھی سیدھی راہ دکھادی ہے۔ ورنہ تھانوں میں تو برسے برسے بد معاشوں کی لٹھکائی ہوتی ہے اور دو ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔“

اشفاق اپنی بات پر زور دے کر کہنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ یہی تو میں بھی کہتا کرتا تھا کہ انسان کے دماغ میں تجویز اللہ میاں کی طرف سے آتی ہے۔ اگر خدا کی مرضی نہ ہو تو انسان لاکھ ہاتھ پاؤں مارے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خدا کی مرضی تھی کہ کالیا بد معاشی اور جرائم کی دنیا کو چھوڑ کر شریفوں کی صف میں آجائے۔ یہ واقعہ تو ایک بہانہ تھا۔ اب تم یقین رکھو۔ کالیا ساری زندگی نیک بنا رہے گا۔“

بس راوی پٹلی کے مضامینات میں داخل ہو گئی تھی۔ ہم بس سے اترے ز اشفاق کہنے لگا۔

”یار! اپنے یار سے چل کر رہتے ہیں اور اس سے پوچھیں تو سہی کہ اس نے کونسا ستر پڑھ کر پھونکا تھا کہ کالے بد معاش کی کالیا پلٹ گئی۔“

ہم وہاں سے ٹیکسی لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر آ گئے۔ خان کے کمرے میں گئے تو وہ ہمیں دیکھ کر نہیں پڑا۔ اس نے اشفاق سے پوچھا۔

”کیوں بھڑ؟ ٹھیک ہو گیا نا بد معاش! نکال دی نا ہم نے اس کی بد معاشی۔“

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اشفاق نے ہنس کر پوچھا۔
 ”یہ تو بتاؤ کہ تم نے کونسا منتر پھونکا تھا۔ وہ تو ساری بد معاشی بھون
 گیا ہے۔“
 خان ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

”پولیس والوں کے پاس بڑے منتر ہوتے ہیں اور چونکہ یہاں تم سچ
 میں آگئے تھے اس لئے میں نے اپنا ایک خاص منتر استعمال کیا تھا۔
 یہ منتر ایسا ہے کہ اگر چنگیز خان بھی ہمارے تھانے میں آجائے اور
 میں اس پر یہ منتر استعمال کروں تو وہ اپنی ساری تلواریں بازووں
 چائے اور پولیس کو سارا حساب بتا دے کہ اس نے کتنے آدمیوں کو
 قتل کیا ہے اور کتنے بے گناہوں کی کھوپڑیوں کے کنارے ہائے ہیں۔“
 اشفاق نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

”یہ تمہاری فرض شناسی اور ٹیک دلی ہے کہ تم ایک مچھے ہوئے
 بد معاش کو سیدھی راہ پر لے آئے ہو۔ اچھا پارا! اب ہم چلتے
 ہیں۔“
 خان نے کہا۔

”یار! پتہ ہی آئے ہو تو دو ایک دن میرے پاس بھی رک جاؤ۔ تم
 کب لاہور سے نکلے ہو۔“
 اشفاق نے کہا۔

”خان! تمہیں معلوم نہیں کہ میں پیچھے کتنے کام ادھورے چھوڑ کر
 آیا ہوں۔ اب مجھے اجازت دو۔ انشاء اللہ دوسری بار آیا تو ضرور
 تمہارے پاس غصیوں گا اور ہاں! لڑکی خیم اور اس کے خاوند کا
 خیال رکھنا۔ ویسے مجھے پورا یقین ہے کہ کالیا کوئی ایسی دیکھی حرکت
 نہیں کرے گا۔“
 خان نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

”اس کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔ میں نے اسے ایسا سیدھا کیا ہے کہ پھر
 کبھی ٹیڑھا نہیں ہوگا اور اس کے ساتھیوں کو تو میں نے شاباز اسلحہ
 رکھنے اور ہوائی فائرنگ کرنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا
 ہے اور اس کا مقدمہ تیار کر دیا ہوں۔“

خان نے ہم سے بغل گیر ہو کر خدا حافظ کہا۔ بولا۔
 ”تمہارے پاس گاڑی نہیں ہے کیا؟“
 میں نے کہا۔

”جی نہیں! مگر ہم ٹیکسی کرائیں گے۔ شیشن یہاں سے زیادہ دور
 نہیں ہے۔“

اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا شیشن
 پہنچ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور سے پنڈی اور پنڈی سے لاہور والی ریل کار
 نئی تھی چلی تھی۔ لاہور سے یہ ریل منہ اندھیرے چلا کرتی تھی جبکہ راولپنڈی
 سے تین ساڑھے تین بجے بعد دوپہر چلتی تھی۔ اس میں سیٹ بک کرائی چاقی
 تھی۔ ہم اللہ توکل آگئے تھے۔ ہمیں دو سیٹیں مل گئیں۔

لاہور ریل کار رات کے نو ساڑھے نو بجے پہنچی۔ اشفاق نے مجھ سے
 وعدہ لیا کہ میں یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن آج میں نے اس کا یہ
 وعدہ توڑ دیا ہے۔ وہ بھی مجھے معاف کر دے اور خدا بھی مجھے معاف کرے۔
 اب اس لڑکی خیم کا مختصر سا ذکر ضرور کروں گا۔

وہ بڑی کامیاب بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے گھر گریختی کو خوب سنبھالا۔
 اس کے ہاں چار لڑکے پیدا ہوئے۔ اشفاق ان کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔
 وہ ان کا حال احوال معلوم کرتا رہتا تھا اور وقت بڑنے پر ان کی مدد بھی کرتا
 تھا۔ کرم راہ بھی ہوا اچھا خاوند ثابت ہوا۔ آج خیم بڑی فارغ البال زندگی بسر
 کر رہی ہے۔ اس کے چاروں لڑکے برسر روزگار ہیں۔ ان کے بھی بچے ہو گئے
 ہیں۔ گھر میں ہونٹیں آگئی ہیں۔ انہوں نے چھٹی مٹیلا سیٹ ٹاؤن میں اپنا مکان

بنالیا ہے۔ جب بھی ہمیں یا اس کا کوئی بیٹا یا کرم داؤد لاہور آتے ہیں تو سیدھے اشفاق کے ہاں آتے ہیں اور مجھ سے بھی ملتے ہیں۔ اشفاق سے جب بھی میں اس واقعے کا ذکر کروں تو وہ کان کو انگلی لگا کر یہی کہتا ہے۔
”اللہ کا بڑا کرم ہوا تھا۔“

پاکستان میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام میں قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی اور اشفاق احمد کی کوششوں کو بڑا عمل دخل تھا۔ اس گلڈ کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور کیا رائٹرز گلڈ یہ اغراض و مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی؟ مجھے ان سوالوں سے اس وقت کوئی سروکار نہیں ہے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان تین ہوں کے ارادے ٹھیک تھے اور وہ دل د جان سے پاکستان کے ادیبوں شاعروں کی بھلائی چاہتے تھے۔

دوسرے صوبوں کی طرح لاہور میں بھی رائٹرز گلڈ کا دفتر قائم ہو گیا۔ یہ دفتر مختاری روڈ پر ایک متروکہ کونویں میں تھا اور اب بھی وہیں ہے۔ مگر اب اس کی حالت خستہ ہو گئی ہے اور اس کے چہرے پر ذہن رونی اور شادابی نہیں ہے جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ شروع شروع کے زمانے میں یہاں بڑے بلیک وغیرہ ہوتے۔ باہر سے آنے والے ادیبوں شاعروں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ پاکستان کے کسی بھی صوبے سے کوئی ادیب شاعر لاہور آتا تو وہ گلڈ کے دفتر میں ضرور آتا۔ میں کس کس کا نام لیں۔ سبھی آتے تھے۔ سب سے ملاقات ہوتی تھی۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کا پہلا ایلاس کراچی میں منعقد ہوا تو لاہور سے ہم سب کراچی گئے۔ ایک ٹرین میں سب کی سیٹیں ریڑر تھیں۔ یہ ادیبوں کا تالہ تھا۔ نشیمن پر بڑی رونق لگی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف ادیب اور شاعر نظر رہے تھے۔ میں اور ابن انشاء جس ڈبے میں بیٹھے تھے اسی ڈبے میں ہمارے ساتھ صوفی ہمیں صاحب بھی تھے۔ صوفی صاحب اپنی جگہ پر خود اک انجمن تھے۔ پاکستان میں ہر جگہ ان کے حراج اور شاکرہ کھڑے ہوئے تھے۔

ان کی شخصیت میں امرتسری کشمیریوں کی بھرپور جھلک نمایاں تھی۔ لہجہ خالص امرتسری کشمیریوں کا تھا۔ میں اور اشفاق ان کی باتیں بڑے مزے لے لے کر کرنا کرتے تھے۔ ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا ہوں کہ ابن انشاء کی طرح اشفاق احمد میں بھی طرافت کی حس بہت گہری ہے۔ ہمارا آپس میں مزاج ملا ہوا ہے۔ بڑی بڑی سنجیدہ محفلوں میں اگر ذرا سی کوئی نازک طرافت والی بات ہو جاتی تو ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگتے۔ دوسروں کو کوئی خبر نہ ہوتی کہ ہم کس بات پر محظوظ ہو رہے ہیں۔

کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ وہ محفل میں بڑی سنجیدہ اور مدلل گفتگو کرتے کرتے اچانک کسی بات پر بھری طرف دیکھتے تو ہم دونوں اپنی ہنسی کو بڑی مشکل سے قابو میں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم ہنسی کو قابو نہ کر سکے۔ میں اجلاس سے اٹھ کر باہر جا کر دو دوڑے اکیلا ہی بیٹے لگ جاتا اور اشفاق یہ کہتا کہ گفتگو کرتے ہوئے کوئی اظہار بیان کر دیتا اور پھر کھل کر ہنس پڑتا۔ ٹرین ابھی لاہور نشیمن کے پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔ صوفی صاحب رتھ پر سونے کے لئے اپنا نام بھام لگا رہے تھے۔ اشفاق پہلے سے کراچی پہنچ چکا تھا۔ میرے ساتھ ابن انشاء تھا۔ محمود اختر کیا بی تھا اور دو تین اور ادیب بھی تھے۔ ٹرین کا وقت ہو گیا۔ گاؤں نے سینی بجائی۔ انجمن نے وصل دیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر ایک جگہ سے دھچکے کے ساتھ کھسکے گئی۔

شام کے وقت ٹرین چلی تھی۔ راستے میں اب یاد نہیں کونسا نشیمن آیا۔ گاڑی وہاں رکی تو ایک بڑا مدد قسم کا بزرگ عشق فانی شاعر ہمارے ڈبے کے پاس آیا۔ صوفی تبسم کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے کہا۔

”صوفی صاحب! آپ ان لوگوں کو جاننا سمجھائیں۔ کچھ شاعر ڈبے میں بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ کوئی دیکھے گا ہم ادیبوں کی بڑی بدنامی ہوگی۔ سارے پریش میں یہ بات آجائے گی۔“

صوفی صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک کان کو ہاتھ سے

بھٹکتے ہوئے اس بزرگ سے پوچھا۔

”یہ نبیؐ کو کسے ڈبے میں ہیں؟“

بزرگ شاعر نے انہی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہاں سے تین ڈبے چھوڑ کر چوتھے ڈبے میں بیٹھے ہیں۔“

صوفی صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوتا ہوا ڈبے سے اترتے

ہوئے بولے۔

”ابھی جان کر ان کی خبر لیتا ہوں۔ ان کو شرم آئی ہے۔“

صوفی صاحب اگلے ڈبوں کی طرف تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔ وہ

بزرگ شاعر جنہوں نے بھڑکی کی تھی وہ بھی اپنے ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔

اتنے میں ٹرین چل پڑی۔ دو تین سیٹیں گزر گئے۔ رات ہو گئی تھی۔ صوفی

صاحب اپنے ڈبے میں داخل نہ آئے۔ ایک پورے سیٹیشن پر پچھڑی کھڑی ہوئی

تو میں نے اس انشاء سے کہا۔

”میں جا کر صوفی صاحب کا پتہ کرتا ہوں کہ وہاں مجھے بھی ہیں کہ

نہیں۔“

وہ ڈبہ کافی آگے تھا۔ میں کئی ڈبے چھوڑ کر اس ڈبے کے پاس پہنچا تو

دیکھا کہ اس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازے کی کڑکی کاپٹ بھی گرا ہوا تھا

اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اندر

سے کسی نے سدا دی۔

”کون ہے یہی؟“

میں نے اپنا نام لیا تو دروازہ کھل گیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ میرا ایک شاعر دوست تھا۔

میں نے پوچھا لیا۔

”صوفی صاحب ادھر آئے تھے۔ کہاں ہیں وہ؟“

شاعر شرے نظروں سے مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”اندر آ کر دیکھ لو۔“

میں ڈبے کے اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ٹافوش کی محفل گرم ہے

اور صوفی صاحب صدر محفل بنے بیٹھے ہیں اور کسی شاعر کے کام پر سر ہلا رہا

کر رہا ہے۔ میں۔ ان کا چہرہ تنہا رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اشارے سے

ڈانٹ کر کہا۔

”اوسے دروازہ تو بند کر۔“

کراچی بیچ کر ادیب شاعر اپنے اپنے گھرانوں پر چلے گئے۔ کسی کو کسی

بجہ ٹھہرایا گیا تھا۔ کوئی اپنے کسی رشتے دار کے ہاں چلا گیا۔ راسخہ گلزار کا

مرکزی اور عارضی دفتر۔ کیلیٹر ہوٹل میں تھا۔ اشفاق احمد مجھے ملا تو کہنے لگا۔

”تمہارے لئے شباب صاحب نے اسی ہوٹل میں ایک کمرے کا

بہار دست کر دیا ہے۔“

میں بے ٹافوش ہوا۔ کیونکہ اکیلیٹر ہوٹل اس زمانے کے کراچی کے

اعلیٰ ترین اور صاف ستھرے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ اشفاق مجھے میرے

کمرے میں لے آیا۔ چھوٹا سا مگر بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ کہنے لگا۔

”میں شباب صاحب کے پاس ہی ٹھہرا ہوں مگر فکر نہ کرو۔ ہماری

ملاقات ہوتی رہے گی۔ یہاں روز ہی تو آنا ہوگا۔“

گلزار کے اجلاس خالق بنگال میں منعقد ہوئے تھے سارا دن وہاں رونق

گئی رہتی۔ کراچی کی آبادی بڑی مختصر سی تھی سڑکوں پر کوئی رش نہیں ہوتا

تھا۔ اختتامی اجلاس میں صدر ایوب مہمان خصوصی تھے۔ سارا ہال ادیبوں

شاعروں دانشوروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسرے چھوٹے چھوٹے

اجلاس شروع ہو گئے۔ میں اور امین انشاء اکثر ان اجلاس میں سے آگے بھاگ

بھاگ جاتے اور صدر کے علاقے کی سیریں کرتے۔ کبھی میں اکیلا نیچے آکر

ہوٹل کی بار میں بیٹھ بیٹھ جاتا۔

کبھی روز شام کو ہم سندھ کی سیر کو نکل جاتے۔ ایک روز ہمارے ساتھ

اشفاق احمد بھی تھا۔ اسے زبوسنی ساتھ کھینچا پڑتا تھا۔ اس روز ہم تینوں کلفٹن تھے۔ کراچی کا سمندری ساحل اس زمانے میں بھی بالکل خالی خالی ہوتا تھا۔ ساحل پر کوئی درخت نہیں تھا۔ اب وہاں ٹائریں کے درخت لگانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے مگر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کراچی کی سمندری ہوا جنوب مشرقی سمندروں کی ہوا نہیں ہے۔ مگر سمندر کا جلال دہی ہے جو سمندر کا ہوا کرتا ہے۔ انسان یہ سوچ کر حیران ہوتا ہے کہ اتنے عظیم الشان سمندر کو دشمن نے کس طرح اپنی کشش کے چال میں جکڑ رکھا ہے۔ صرف چاند رات کو سمندر کی پانچویں موجیں چاند کو دیکھ کر آپس سے ہمارے ہوتے ہیں اور اچھل اچھل کر چاند کی طرف جانے کی کوشش کرتی ہیں اور یوں ساحل کے قریب ایک علاقہ سارے کا سارا زیر آب آجاتا ہے۔ اب ساحل کے قریب کراچی کا سمندر بھی آلودہ ہو گیا ہے۔ کراچی کی اپنی فضا بھی آلودہ ہو گئی ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس شہر کو دشمن کی نظر لگ گئی ہے۔ میں نے ہی نظر کا قائل ہوں۔ بری نظر لگ جاتی ہے بری نظریہ رپ اور امریکہ میں ٹلک جاتی اگر وہاں بری نظر لور حاسدانہ نظر ڈالنے والے لوگ ہوتے۔ مگر وہاں لوگوں کو بری نظر نہیں لگتی۔ کیونکہ وہاں لوگ دوسرے کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ لوگ بہت کم ہلکے نہ ہونے کے برابر حسد کرتے ہیں۔ زیادہ تر رشک کرتے رہیں اور رشک ایک صحت مند جذبہ ہے۔ حسد میں آدمی دوسرے کے مرجانے کی بددعا کرتا ہے اور رشک میں آدمی اس سے زیادہ ترقی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں تب کراچی کی فضا بڑی خوبصورت تھی۔ لوگوں کی نگاہیں صحت مند اور پاک تھیں۔ ساحل سمندر پر دور دور سے آہستہ دالی موجوں کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔ اب کلفٹن سے ذرا الگ ہو جائیں تو سمندر کی تواز رکشوں اور ویگنوں کے شور میں غم ہو جاتی ہے۔ جس سڑک پر ایکسپریسز بولتے تھے وہ سڑک شام کو شفق کی روشنی میں

نہری ہو جاتی۔ چونکہ سڑک پر ٹریفک بہت ہی کم ہوتا تھا اس لئے دوسرے سوچ کی سرخ روشنی دور تک سڑک پر دکھائی دیتی۔ گھڑ کا عارضی دفتر دول کی دوسری منزل پر تھا۔ شام کو یہاں پر ہماری خوب محفل لگتی۔ ایمن انشاء اور میں تو تقریباً روزانہ ہی وہاں شام کے وقت موجود ہوتے تھے۔ اشفاق احمد بھی وہاں شباب صاحب کے ساتھ آجاتا۔ پھر محفل کا رنگ ٹھہر جاتا۔ وقت بتا تو میں "ایمن انشاء اور اشفاق صدر کے فٹ پاؤں پر گئی پرانی کتابیں دیکھنے نکل جاتے۔ وہاں اردو انگریزی کتابوں کے ڈیرے لگے ہوتے۔ اشفاق اور ایمن انشاء وہاں بیٹھ جاتے اور کتابیں لٹ پٹ کر دیکھتے۔ ایک بار ایمن انشاء نے کہا۔

"ایک دن ہماری کتابیں بھی اس طرح فٹ پاؤں پر پڑی ہوں گی۔"

صدر میں ہی کافی باؤس بھی تھا۔ وہاں بیٹھ کر کافی پیچھے اور کراچی کے ارد گرد اور دانشوروں سے باتیں کرتے۔ کراچی میں ابھی آبادی کا مطالبہ نہیں آیا تھا اور پچیس بڑی خالص مل جاتی تھیں۔ چنانچہ کراچی کے کافی باؤس کی کافی بھی بڑی خاص اور تلخ ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لیگنہ روزگار دانشوروں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ جن کی یادیں مجھے آج بھی بڑی عزیز ہیں۔ ہم لوگ تقریباً ایک ہفتہ کراچی میں رہے۔ پھر لاہور واپس آ گئے۔ یہاں آتے ہی راسخو گھڑ سب انتخابات شروع ہو گئے۔ انتخابات کے ساتھ سیاست بھی گھڑ میں داخل ہو گئی اور سیاست نے فضا کو آلودہ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے نہ گھڑ کی سیاست سے کوئی سروکار تھا نہ انتخابات سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں الگ ہی رہا۔ ایمن انشاء کا دفتر بھی گھڑ کے دفتر کے ایک کمرے میں ہی تھا۔ میں اگر وہاں جاتا تو صرف ایمن انشاء سے ملنے کے لئے جاتا۔ یا جب اشفاق وہاں تھا تو وہاں کے بعد اس سے ملنے چلا جاتا۔ چائے کا دور چلتا۔ خوب باتیں کرتے لیٹنے بازی ہوتی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اشفاق احمد کو اوپ کی سیاست سے نکال کر زندگی کے شلال مار مار میں لے جاتا جہاں آم کے درختوں میں کوئیں بول رہی ہوتیں اور فضاؤں میں آم کی میٹھی خوشبو نہیں پھیلی ہوتی۔

جس دن اشفاق احمد ریڈیو سٹیشن آتا تو مجھے پتہ چل جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اپنے ضروری کام سے فارغ ہونے کے بعد اوپر دو سرے میں میرے کمرے میں آجاتا اور کبھی میں اسے تلاش کر لیتا۔ عام طور پر ہماری محفل اکرم ہٹ صاحب کے کمرے میں ہوتی تھی۔ اکرم ہٹ کے کمرے میں کام بھی ہوتا تھا اور آرٹسٹوں کی رونق بھی تھی رہتی تھی۔ شروع گرمیوں کے موسم میں مویا کھیلنا تو گلوکارہ شمشاد پٹیل اپنی کوشی سے توڑ کر مویوں کے پھول لاتی اور اکرم ہٹ کی میز پر بھی پھولوں کی ڈیسری رکھ جاتی۔ کسی روز ملکہ غزن فریدہ خانم بھی اپنی گاڑی میں مویچے کے پھول بیگ میں بھر کر لے آتی۔ اس روز اکرم ہٹ کا کمرہ مویچے کی خوشبو سے منک رہا ہوتا۔ اشفاق پٹیل سے وہاں بیٹھا ہوتا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا اور چائے پیتے ہوئے ہم باتیں کرنے لگتے۔ اگر سرمدیوں کا موسم ہوتا تو ہم ریڈیو سٹیشن کے سامنے والے پلاٹ میں گلاب کی کیاریوں کے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ وہیں چائے منگوا کر پیتے۔ کیاریوں میں ولایتی گلاب کے رنگ برنگ پھول مہربی دھوپ میں خوب کھلے ہوئے ہوتے تھے۔ کوئی ہنسا گاٹا ہوتا تو کوئی گھڑا سرخ کوئی زرد اور کوئی بالکل سفید۔۔۔ چہرے نہیں آتا تھا کہ یہ نازک حسین ترین پھول زمین کے اندر سے نکلتے ہیں۔ یہ تو کوئی آسمانی مخلوق لگتی تھی۔ ہمیں پلاٹ میں بیٹھے دیکھ کر کبھی امیر حسین واسطی نواز بھی ہمارے پاس آجاتا۔ امیر حسین کو سب انہیں کے نام سے بلاتے تھے۔ بڑا ہنس کھنکھاتا اور دل نواز آرٹسٹ تھا۔

کلا رنٹ نواز صادق علی مانڈو وہاں سے گزرتا تو وہ بھی ہمیں دیکھ کر

آجاتا۔ صادق علی مانڈو ملک کے نامور کلا رنٹ نواز ہیں۔ ان کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ریڈیو سٹیشن کے ہال میں جتن بھاروں کی تقریب منعقد ہوئے والی تھی۔ سٹیشن ڈائریکٹر نے مانڈو صاحب کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ تمام آرٹسٹوں کا انتظام کریں گے تاکہ وہ وقت پر ریڈیو سٹیشن پہنچ جائیں۔ ہم لوگ ریڈیو کی کنٹینر کے باہر لمبی میز کے آگے بچ پر بیٹھے تھے کہ صادق علی مانڈو بھی ہمارے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ سٹیشن ڈائریکٹر قریب سے گزرے تو انہوں نے مانڈو صاحب کو دیکھ کر پوچھا۔

”مانڈو صاحب! سب آرٹسٹ آگئے ہیں نا؟“

مانڈو صاحب نے فوراً جواب دیا۔

”سب آرٹسٹ پہنچ گئے ہیں جناب!۔۔۔“ ملکہ ترنم توڑ جہاں بھی

آگئی ہیں۔ ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم بھی آگئی ہیں۔ ملکہ غزل

فریدہ خانم بھی آگئی ہیں۔ بس اب صرف ملکہ الزبتھ کا انتظار ہے۔“

کسی روز ہم ایوب رومانی کے کمرے میں بیٹھ کر چائے پیتے اور محفل لگاتے۔ ایوب رومانی بڑی ذمہ اور توانا شخصیت کا مالک تھا۔ موسیقی پر اسے کافی عبور حاصل تھا۔ موسیقی کی تعلیم اس نے بھائی لال امرتسری سے حاصل کی تھی۔ وہ تمام رموز سے واقف تھا۔ ہنس کھنکھاتے شکل اور جوان رہتا تھا۔ میرے اور اشفاق کے ساتھ اس کی بے تکلفی تھی۔ چنانچہ اس کے کمرے میں بیٹھ کر محفل لگانے کا بڑا مزہ آتا تھا۔ ایوب رومانی ریڈیو سٹیشن کے ان بھور درختوں میں سے ایک بھرپور درخت کی طرح تھا جس کی چھانوں میں بیٹھ کر آرٹسٹ پروڈیو سر ریڈیو کے لئے نئے نئے پروگرام سوچتے اور تحقیق کرتے تھے۔ یہ درخت ایک ایک کر کے گرتے چلے گئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ اشفاق کا جسم بھاری ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر متانت اور بزرگی طاری ہو گئی تھی۔ ہوائی کے دنوں میں بھی وہ اپنے چند

ایک بے تکلف دوستوں کے سوا کسی سے نہیں کہتا تھا۔ مگر یہ وہ بڑا بندہ ہو گیا تھا۔ صرف میں اسے اس خیل سے باہر نکالتا تھا۔ افسانے لکھنے اس نے چھوڑ دیئے تھے۔ اب اس کی ساری توجہ ٹیلی ویژن کی طرف ہو گئی تھی۔ ٹیلی ویژن کے لئے وہ بڑے زوردار ڈرامے لکھتا۔ ڈراموں کی میرٹل لکھتا۔ وہ ان ڈراموں کو بڑی کاوش اور محنت سے لکھتا تھا۔ ایک بار اس نے ”مگرین کارڈ“ کے نام سے بڑا زبردست اور پراثر ڈرامہ لکھا۔ میں نے ڈرامہ ٹی وی پر دکھانے اس کی آمواں نگاری دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مجھے مانتو میں نے اسے کہا۔

”تم نے اتنا بڑا موضوع ٹیلی ویژن پر ضائع کر دیا ہے۔ بہتر تھا کہ“

اس پر تم ایک ناولٹ لکھتے۔“

مگر وہ نہ ہا۔ کہنے لگا۔

”یو یو ٹی وی کا میڈیم بڑا وسیع ہے۔ میں اگر ناولٹ لکھتا تو کتنے لوگ اسے پڑھتے؟ تم ناؤ۔ زبان سے زبان چھوڑا کر آدی اپنے پڑھتے۔ مگر ٹیلی ویژن پر بڑے بڑے کو لاکھوں مگر ٹی ویوں نے دیکھا ہے۔ یوں میرا خیال کرو ٹی ویوں تک پہنچ گیا ہے۔“

مجھے اس وقت بھی اس معاملے میں اشتقاق سے اختلاف تھا اور آج بھی ہے۔ خیر اب تو اشتقاق احمد نے ٹیلی ویژن کے لئے لکھنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اس نے ٹیلی ویژن کے لئے لکھ کر اچھی ملاحتوں کو ضائع کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹی وی پر لاکھوں آمواں لوگ دیکھ لیتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کوئی کام نہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ ان کے افسانے بنا دیتا یا ناول لکھ دیتا تو آج وہ لوگوں کے پاس موجود ہوتے اور لوگ انہیں پڑھ رہے ہوتے۔ مگر اشتقاق کو تو ٹیلی ویژن کے لئے لکھنے کا جنون ہو گیا ہوا تھا۔ میرے خیال کے مطابق اور میری ذاتی رائے میں ٹیلی ویژن اور ٹی وی لکھنے والے رانٹلوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ دیکھ لیں۔ آج بھی لوگ اشتقاق احمد کے افسانے ”گھر رات“ اور ناولٹ ”مصران

بہار“ کی بات کرتے ہیں۔ لوگوں کو اس کے افسانے یاد ہیں۔ اس کے ٹیلی ویژن کے ڈرامے لوگ بھول گئے ہیں۔ مگر میں اشتقاق کو نہیں سمجھا سکتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں بھی آ ہی نہیں سکتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ڈائجسٹوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ان ڈائجسٹوں میں سنسنی خیز جاسوسی کہانیاں، شیر کے شکاریوں کے قصے اور لڑائی مار دھاڑ والے واقعات چھپتے تھے۔ ان رسائلوں کا ایک اپنا الگ کرشن مزاج تھا۔ اشتقاق اس مزاج کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے ایک ڈائجسٹ میں ”سفر و سفر“ کے نام سے اپنا سفر نامہ لکھنا شروع کیا جو خاص ادبی چیز تھی۔ یہ سفر نامہ مجھے خود اس ڈائجسٹ میں اجنبی اجنبی سا الگ اشتقاق کا خیال تھا کہ وہ کرشنل رسائل میں اس کی شمع جلانے لگا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ یہ ایک ان ٹیچل بات تھی اور وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ مانتو کی گردن میں رکھا ڈال کر اسے اپنے گھر میں ڈالنے کی کوشش تھی جس میں اشتقاق ناکام رہا۔

کراچی کے ایک ڈائجسٹ کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا۔

”آپ اشتقاق صاحب سے کہیں کہ وہ ہمارے ڈائجسٹ کے لئے کوئی سلسلہ شروع کریں ہم انہیں مستقل مواد نہ دیں گے۔ میں خود ان سے ملا ہوں اور ان کو دعوت دیتی ہے مگر وہ نال گئے ہیں۔“

میں نے جواب میں کہا۔

”ڈائجسٹ کے لئے لکھنے کے واسطے ایک خاص قسم کا کرشنل مزاج ہونا چاہیے جو اشتقاق کے پاس نہیں ہے۔ ویسے میں اس کو کہہ کر کوئی سیریز آپ کے لئے لکھوانے کی کوشش ضرور کر دیا گا۔“

میں نے اشتقاق سے بات کی تو وہ بولا۔

”یار میں ڈائجسٹ کے لئے کیا لکھوں؟“

میں نے کہا۔

”تم ایسا نثر ڈائجسٹ میں سلسلے دار اپنی آپ جی لکھنا شروع کر دو۔“

تم مشہور آدمی ہو۔ لوگ تمہارے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ لوگ اسے پسند کریں گے۔“

اشفاق نے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں مجھے کتنے صفحے لکھنے ہوں گے؟“

میں نے کہا۔

”یہ تمہاری آپ بیتی ہوگی۔ تمہیں ڈائجسٹ کے کم از کم چھ روپے صفحے تو ہر بار ضرور لکھنے ہوں گے۔“

”ڈائجسٹ کی لکھائی تو بڑی باریک ہوتی ہے اور سطریں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ تمہارے خیال میں مجھے مسودے کے کتنے صفحے ہر بار لکھنے پڑیں گے؟“

مجھے ڈائجسٹوں کی چھائی وغیرہ کا اندازہ تھا۔ میں نے اشفاق کے مسودے بھی دیکھے ہوئے تھے کہ وہ کتنی سلیس یا سلیکھتا ہے اور ہر صفحے پر کتنی سطریں ہوتی ہیں۔ میں نے تھوڑا سا حساب لگا کر بتایا۔

”تمہیں ہر ماہ کم از کم ساٹھ ستر صفحے لکھنے پڑیں گے۔“

”اف تو بہ۔“ اشفاق گھبرا گیا۔ ”یہ تو پورا مسودہ ہو جائے گا۔ نہیں یاں میں اسے صفحے کیسے لکھوں گا اور پھر وہ بھی ہر مہینہ! اور صرف ڈائجسٹ کے لئے؟“

اشفاق احمد کا بیٹا رائیٹنگ برا خوبصورت ہے۔ اس کے لفظ بڑے جم کر کانڈ پر درج ہوتے ہیں۔ جیسے میرا بیٹا رائیٹنگ کانڈ کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ کانڈ لکیر دار ہو تو میری سطریں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ قلم یا ہال پوائنٹ ٹیلے رنگ کا ہو تو میری لکھائی بدل جاتی ہے۔ میں صرف سفید کانڈ کاٹے ہال پوائنٹ سے ہی ٹھیک لکھ سکتا ہوں۔ مگر اشفاق کی لکھائی ہر حال پوائنٹ اور ہر قلم اور ہر سیاہی کے ساتھ ٹھیک رہتی ہے۔ ”قلعین شہاد“ کا مسودہ وہ کانڈ کٹ کر اس کی لمبی لمبی سلیس بنا کر ان پر لکھتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی وہ ایسا

ی کرتا ہو گا۔ لکھنے میں اس کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اعلیٰ زبان والوں کی رد و لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش غیر شعوری ہوتی ہے۔ مثلاً ژکھانوں کے کسی اوزار کے لئے فکر پنجابی کا کوئی لفظ موجود بھی ہو تو وہ اردو کا غلط ڈھونڈ کر لائے گا جیسے وہ چالو اردو زبان میں استعمال ہوتا ہوتا ہو۔ ان اثناء بھی اپنی نثر میں یہی کیا کرتا ہے۔ مگر ان دونوں کی اردو سادہ اور عام لہجہ ہوتی ہے۔ بلکہ میں پنجابی میں اردو لکھتا ہوں اور میرے کردار اکثر پنجابی کے الفاظ بول جاتے ہیں۔

لباس کے معاملے میں اشفاق کا معاملہ یہ ہے کہ شروع شروع میں وہ پتلون قمیض استعمال کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے شلوار قمیض کو اپنایا اور آج تک وہی پہن رہا ہے۔ وہ خوش لباس ہرگز نہیں ہے۔ اسے اچھا لباس پہننے کا شوق بھی نہیں ہے۔ وہ اس لئے سادہ لباس نہیں پہنتا کہ ایسا کرنا سادگی اور درویشی کی علامت ہے۔ بلکہ اس کی وجہ ضرورت سے زیادہ اور سنجوسی نی حد تک پہنچی ہوئی کفایت شعاری ہے۔ وہ بڑا زبردست کفایت شعار ہے۔ پچھلی سے پچھلی سرروپوں میں ایک رات میں اس کے گھر گیا تو وہ پرانا سا کالا گرم اف کوٹ اور پرانی سی شلوار قمیض پہن کر کمرے میں آیا تو مجھے بائراک کا بڑا حاکور پوچھا آگیا۔

کھانے پینے کے معاملے میں بھی وہ بڑا کفایت شعار ہے۔ نہ سگریٹ پیتا ہے نہ شراب پیتا ہے نہ زیادہ چائے پیتا ہے نہ ہوٹلوں میں بیٹھ کر قیمتی کھانے کھاتا ہے۔ کبھی پان کھا پیتا تھا مگر اب وہ خدا جانتے کیا کوٹ کر اس کی پینکی منہ میں ڈال لیتا ہے اور چہان رہتا ہے اور اس کے قریب بیٹھے ہوں تو کبھی سو فک کی خوشبو آتی ہے۔

اس کے قریب بیٹھے ہوئے مجھے کبھی کسی پرفیوم کی خوشبو نہیں آتی۔ عید کا رڈ وہ اکثر اپنے ہاتھ سے بنا کر مجھے پوسٹ کرتا ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑا اچھا گھریلو متکا ہے۔ اسے نو نو کرانی اور پرائیٹنگ کا بھی برا عقیدہ ہے۔ کبھی

اس نے ان شیعوں کے متعلق ہر قسم کا سلسلہ گھر میں لا کر رکھ لیا تھا۔ مگر مجھے بھی کبھی نہیں دکھایا۔ نہ کبھی اس نے میری کوئی تصویر اتاری ہے۔ کبھی بھی میرا بڑا جی چاہتا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم میں اسے سگت ہی لگا دوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اشفاق کی قوت ارادی بڑی مضبوط ہے اور اگر میں نے چالاکی سے کام لے کر اسے سگت لگوا بھی دیے تو وہ خود ہی چا کرے گا مجھے ایک سگت بھی نہیں پلائے گا۔ شروع شروع میں وہ ایک آدھ سگت پی لیا کرتا تھا۔ کبھی لگا کر اسی کا دھواں منہ ہی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کسی نے اسے سمجھایا ہو گا کہ اس طرح تو واقعی دولت خالص کر رہا ہے یا تو سگت کے دھوئیں کو بیت کے اندر لے جا تاکہ کچھ تو پتہ چلے کچھ تو سمجھائے بیت کے اندر جائے اور اگر صرف کبھی لگا کر دھواں منہ ہی سے باہر پھینک دیتا ہے تو کیا فائدہ؟ اشفاق نے ایک دن وہ کبھی کبھی کا سگت پی لیتا بھی ترک کر دیا۔

میرے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ میں یا تو قدم اٹھانے کے بعد سوچتا ہوں یا سوچتا رہتا ہوں اور قدم نہیں اٹھاتا۔ مگر اشفاق ایسا چرچ نہیں کرتا۔ وہ بڑا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ بلکہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے اور اس کی یہ عادت مجھے بڑی پسند ہے۔ آری کو سوچ سمجھ کر کوئی کام کرنا چاہیے۔ اس طرح آری بیت ہی معینوں سے بچ جاتا ہے۔ مثل کے طور پر اس نے ایک بڑے ہوٹل میں ایک ہی دن میں دونوں میزوں کی شادی کا فرض ادا کر دیا۔ یہ پھر تک پھونک کر قدم اٹھانے کا نتیجہ ہے۔

اس نے اول ٹوکٹن میں جو ممکن بنایا ہے اس کا ذرا رنگ روم بڑا صاف ستھرا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی جو باتھ روم ہے وہ گندا ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اشفاق احمد کے پاس بڑی دولت ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے اس کی دولت کی کبھی ایک جھلک تک نہیں دیکھی۔ میں اس کا شاید واحد بے تکلف دوست ہوں۔ لوگ اس پر دولت مند

ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ یا پھر اس کی ناموری سے حسد کرتے ہیں۔ وہ کھانا بدل کر ایک اور لائن پر آگیا ہوا ہے۔ یہ تصوف کی لائن ہے۔ مجھے تو اس میں کبھی کوئی تصوف نظر نہیں آیا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ وہ صوفی ہے۔ میں نے آج تک سارے کشمیری صوفی ہی دیکھے ہیں جن کے دسترخوانوں پر انواع و اقسام کی یا قرقانیاں، اراروت، شیر مال اور گٹکا ہے اور رش مالو اور گولڈن ہیرے کی چمکتی ڈشیں اور روغن بن چنے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً صوفی عجم، امرتسر کے صوفی غلام محمد اور صوفی حمزہ کاکا۔ کیا خوش خوراک خوش لباس صوفی تھے۔ کھلی کی روشنی یا دھوپ میں آتے تو سرخ و پیچیدہ چوڑا روغن چمکنے لگتا تھا۔ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے دسترخوان پر لائے تھے اور زبردستی کھلاتے تھے اور زبردستی کاغذ بھر کر بچوں کے لئے ساتھ بھی کر دیتے تھے۔ ہر وقت دعوت کرنے، دیکھیں کھڑکھانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے۔ ذرا کسی نے کہا۔

”صوفی جی آج موسم بڑا اچھا ہے۔“

صوفی صاحب نے فوراً اعلان کر دیا۔ اٹھاؤ دیکھیں چلو بڑی شہر۔ دیوین روغن خوش کچے گا، زردہ بھی کچے گا، بلخ کی سیر ہوگی۔ میں تو ایسے ہی صوفی حضرات کو جانتا ہوں۔ اگر مجھے کوئی یہ کہے کہ اشفاق احمد صوفی ہو گیا ہے تو بھلا میں کیسے یقین کر سکتا ہوں۔ جیسا وہ اب تک ہے اسے دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ صوفی نہیں ہے۔ ہاں! اللہ میاں لگا ہوں اور دلوں کے پھیر دینے والا ہے۔ وہ اگر چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

ابن انشاء کی طرح اشفاق احمد کے پاس بھی جو خواتین اس کے انصاف سے متاثر ہو کر آئیں ان کے ساتھ بڑے ادب و کد اب سے گفتگو کرتا اور شرم کے بارے بار بار چرو سرخ ہو جاتا۔ وہ جب کسی لڑکی کو بزرگ بن کر ”کڑے“ کہتا تو جھجھکتا تھا میں اس کی سخت سرزنش کرتا کہ یہ تم لڑکیوں کے آگے بزرگ کیوں بن جاتے ہو؟ کیوں اپنا مستقل نام ایک کر رہے ہو؟ مگر جیسا کہ

میں پہلے کتب کو پڑھا تھا ہوں اشفاق احمد بھو "شریف آدمی" ہے۔ مکی رومان اس کے پاس آئے اور اسے ہاتھ لگا کر آگے کل گئے۔ اشفاق احمد کی شخصیت اور اس کی باتوں میں ایسا اثر ہے کہ لوگ بہت جلد اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ خدا داد صلاحیت ہوتی ہے۔

ہر دور میں اس کی شخصیت کے بارے میں گرد و چار پیارے ضرور گردش کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض سیادوں نے اس سے مخرب ہو کر اپنا راستہ تبدیل کر لیا ہے اور بعض کج بھی بھول گیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح گردش کے جارہے ہیں۔ ایسا ضرور ہوا ہے کہ جو بھی اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس کے قریب آیا کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اندر سے اس کا مخالف بن گیا۔ شروع شروع میں اشفاق احمد کے حلقہ اثر میں جو لوگ بیٹھا کرتے تھے وہ اس کے افسانوں اور اس کے فن کی ضرور باتیں کرتے تھے۔ مگر بعد میں جو لوگ اس کے قریب آئے ان کے منہ سے میں نے اشفاق کے افسانوں اور اس کے افسانوی کرداروں کی کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ کچھ لوگ اس لئے بھی اشفاق احمد کے قریب آ جاتے تھے کہ اشفاق کی بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری افسروں سے ملاقات تھی اور وہ اشفاق کی مدد سے اپنا کوئی نہ کوئی کام نکلوانا چاہتے تھے۔ دوسروں کے کام آنے کے معاملے میں اشفاق احمد بے حد احتیاط سے کام لیتا ہے۔ بڑی تیر کی اور سوالنامہ انہی کے ساتھ مسئلے کے سارے پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ وہ کام کر دیتا ہے مگر غور کرنے پر بہت وقت لگاتا ہے۔

اس کا افسانہ "انگوریا" اس کے دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ میں جب اس افسانے پر ہاتھ رکھتا ہوں تو مجھے مسئلے کے اندر اس کے دل کی ہلکی ہلکی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ اشفاق احمد کے اندر ایک درخت بھی اگ ہوا ہے۔ یہ درخت وہ اپنے آبائی گاؤں گڑھ کسٹر سے اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس درخت پر چڑیاں بیٹھتی ہیں۔ طوطے بولتے ہیں۔ خزاں میں اسی درخت کے پتے زرد ہو

کر چھڑ جاتے ہیں اور بہار میں اس کی شاخوں پر گھٹائی اور نیواری نازک نازک و پتلیں پھوٹتی ہیں۔ اس درخت پر ایک بلبل آکر بیٹھا کرتی تھی۔ اشفاق نے تھ سے اس کا بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ کسی وقت میں بلبل کی اداس آواز سناتا تو شفاق نے اس کے بارے میں سوال کرتا۔ وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ میں اصرار کرتا تو وہ کہتا۔

"میرے درخت کی شاخ پر کوئی بلبل کہاں سے آکر بیٹھے گی۔ تم نے لارنس باغ سے آئی کسی بلبل کی آواز سنی ہوگی۔"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اشفاق احمد کا رسالہ "داستان گو" نیا نیا شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اسے اعلیٰ سے رسالے آتے تھے۔ جن میں سے وہ کوئی مضمون ترجیح کر کے چھاپ دیتا یا کوئی کارٹون یا لطیفہ نقل کر لیتا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ وہ خالی وقت میں "داستان گو" کے دفتر کی میز پر بیٹھا کانٹھ پر انگریزی میں ایم آر کے لفظ شکستہ انداز میں لکھتا تھا۔ جیسے کسی کے دستخط کی نقل اٹارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس کے دستخط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اشفاق ہنس دیا۔

"قلم چالو کرنے کے لئے ویسے ہی ایم آر لکھ دیتا ہوں۔ یہ کسی کے دستخط نہیں ہیں۔"

مگر وہ ایک اعلیٰ لڑکی ماریسا کے نام کے مختصر دستخط تھے۔ اس اعلیٰ لڑکی کے متعلق اشفاق احمد نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

ایک دن کی بات ہے۔ میں "داستان گو" کے دفتر میں اس کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا اور مجھے مال روڈ کی مختصر ٹریک کو دیکھ رہا تھا۔ ریگیل والے بس سٹاپ پر بس آ کر روکتی تو اس میں سے دو چار آدمی اتر جاتے۔ ایک دو سواریاں چڑھ جاتیں۔ بس آگے روانہ ہو جاتی۔ اوسٹری میں کی گاڑیاں ابھی بہت صاف ستھری تھیں اور ان کا رنگ روغن بھی ابھی قائم تھا۔ سڑیوں کا موسم تھا۔ بڑی جھلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں اشفاق کی میز کے پیلوں میں کرسی پر بیٹھا

تھا۔ اشفاق اپنے رسالے کے لئے کوئی مسودہ دیکھ رہا تھا اور اس کی نوک پناہ درست کر رہا تھا۔ اس نے اس ڈاک دے گیا۔ اشفاق مسودہ پر سے کر کے ڈاک کھولنے اور پڑھنے لگا۔ میں کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ ایک سفید لٹافہ چھری سے کھول رہا تھا جس پر یورپ کے کسی ملک کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ لفافے کے اندر سے ٹیلے رنگ کا ایک کانڈ نکلا۔ اشفاق نے نیلے کانڈ پر لکھی ہوئی مختصر تحریر پڑھی اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ دیر کے لئے وہ بالکل سانسٹ سا ہو گیا ہے۔

میں نے پوچھا۔

”کوئی خاص بات ہے؟“

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

”تم مجھ سے بہت پوچھا کرتے تھے کہ میں ایم آر کے لفافہ پر کانڈ پر

لکھا کرتا ہوں یہ کہیں کے دستخطوں کی مشق کر رہا ہوں۔ لو۔۔۔

یہ پڑھ لو۔“

تحریر عکسہ انگریزی میں تھی۔ تین چار فقرے تھے۔ یہ کسی اطالوی لڑکی

کا خط تھا۔ اوپر دائیں اشفاق لکھا تھا۔ نیچے لکھا تھا۔

”میں دوبارہ ہسپتال میں داخل ہو گئی ہوں لگتا ہے یہ بیماری مجھے تم

سے بیش کے لئے جدا کر رہی ہے۔ ایک بار آکر مجھ سے مل لو۔ پھر

مجھے اپنی موت کا کوئی افسوس نہیں ہو گا۔“

نیچے کہنے میں ماریا لکھا تھا۔

لفافہ لاموڑی ایکدم بدل گیا۔ میں نے خط پڑھ کر اشفاق کی طرف

دیکھا۔

”تو یہ وہ لڑکی ہے جس کا نام تم کبھی کبھی کانڈ پر لکھا کرتے تھے۔“

اشفاق نے خط لفافے میں ڈال کر میز کی دراز میں رکھ دیا۔ اس کے

چوڑے چپکے صحت مند چہرے پر بڑی اداس مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

”پدی اچھی لڑکی ہے یہ۔ یورپ کی لڑکی نکلتی ہی نہیں۔“

”کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔“

”محبت!“ اشفاق نے مسکراتے ہوئے گہرا سانس لیا اور بولا۔

”تم تو جانتے ہو میں کبھی ان باتوں میں نہیں پڑا۔ محبت کے معاملے

میں میں بہت زیادہ شرمیلا ہوں۔“

”پھر اس لڑکی کا کیا قصہ ہے۔ اس کے خط سے صاف معلوم ہوتا

ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور ظاہر ہے تم بھی اس سے محبت

کرتے ہو گے۔“

اشفاق کے سامنے چائے کی پیالی پدی تھی جس میں اس کی چائے

ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے چائے کا ٹھنڈا ٹھنڈا لیا اور ٹالی پیالی پیٹ میں

رکھتے ہوئے بولا۔

”اگر تم مجھ سے میرے دل کا حال پوچھتے ہو تو تم سے میں کوئی بات

نہیں چھپاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ماریا سے ایک طرح کا

لگاؤ ضرور تھا تم اسے محبت ہی کہو گے۔ ماریا بھی اسے محبت ہی

سمجھتی تھی۔ مگر جس طرح سے لوگ روایتی اعزاز میں محبت کرتے

ہیں۔ ایک دوسرے سے ملنے کو بے تک رسب ہیں۔ ایک

دوسرے کی جدائی میں آنسو بہاتے ہیں۔ میرے ساتھ ماریا کے

معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اس کے مشرقی نسوانی

حسن اس کی حیا داری اور پاکیزہ خیالی سے متاثر ضرور تھا مگر میں

نے کبھی اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی ایک عجیب و غریب

کیفیت کی اداس لہر میرے دل کو چھو کر ضرور گزرتی تھی مگر میرا

خیال ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ محبت وغیرہ نہیں ہو سکتی۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا ماریا نے بھی تم سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا؟“

اشفاق احمد کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرہ سے گندا تھا کہ اس کے دل میں کئی قسم کے خیالات آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ عجیب و غریب کیفیات کی اداس لہریں اس لئے بھی اس کے دل کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ جس طرح سمندر کی لہریں دور دور سے آکر ساحل کو جھونتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں۔ کہنے لگا۔

”میں نے تمہیں کہا! مارسیا پر مشرقی ایشیائی روایات کا بڑا کمرا اثر تھا۔ ہم نے ایک مدت روم اور فلادلس میں ایک ساتھ سیر و سیاحت کرتے رہے۔ دستور انوں میں چائے پیتے، آرٹ گیلریوں میں اٹلی کے نامور مصوروں کی تصویریں دیکھتے گزار دی۔ موسم خوشگوار ہوتا تو کسی پارک میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے درختوں کے نیچے سیر کرتے یا پھر کسی بچ پر میٹھ جاتے۔ میں مارسیا کو پاکستان کے بارے میں جانتا۔ مارسیا ہونے نور سے میری باتیں سنتی۔ اپنے بارے میں اس نے مجھے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ اس کا ایک بھائی تھا جس کو تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ وہ فرانس کے کسی گاؤں میں مقیم تھا اور کبھی کبھار کرسس کے موقع پر مارسیا کو ایک کرسس کارڈ بھیج دیتا تھا۔“

”مارسیا تمہاری یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی کیا؟“

”نہیں۔“ اشفاق نے کان کھجائے ہوئے کہا۔

”وہ روما کی ایک کتابوں کی دکان پر جاب کرتی تھی۔ جب میں روما سے واپس وطن روانہ ہوا تو وہ اسی دکان پر ملازم تھی۔ وہ مجھے ایروپوٹ پر چھوڑنے آئی تھی۔ مجھے الوداع کہتے ہوئے بالکل مشرقی لڑکیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو چمک آئے تھے۔“

”تمہاری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

میرے اس سوال پر اشفاق نے چائے کی خالی پیالی کو پرے کھینکا

ہوئے کہا۔

”یارا یہ بڑی لمبی رام کہانی ہے۔ پھر کبھی سناؤں گا۔“

میں یہ رام کہانی ضرور سنانا چاہتا تھا۔ ان دنوں ہماری تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک روز میں نے اشفاق کو کابو کر لیا۔ مجھے یاد ہے جنوری دسمبر کے دن تھے۔ بڑی سردی پڑ رہی تھی۔ اس زمانے میں لاہور میں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ جنوری میں تو بارشیں ضرور ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے سردی بندھ جاتی۔ اس روز بھی کافی سردی تھی۔ ایک روز پہلے بارش ہوئی تھی۔ لارڈز ریسٹوران کے اوپر جو شاہ نقیین ہسپ کی ٹیلی ہوا کرتی تھی ہم وہاں آکر بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے کہ اشفاق احمد کی زندگی کا یہ سب سے خوبصورت اور معصوم رومانس ہے جن نے اس کی تحریر اور اسلوب پر گہرا اثر ڈالا۔ اگرچہ اس نے اپنے رومانس کو درجہ صحت و دیگر ای بی بیان کیا ہے۔ میں نے چائے منگوائی۔ چائے آنے تک ہم اوپر اوپر کی باتیں کرتے رہے۔ چائے آتی تو اشفاق نے اپنے قیام روما کی یادوں کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگا۔

”روما میں میرا زیادہ وقت یونیورسٹی میں گزر جاتا تھا۔ میں اطالوی سٹوڈنٹس کو اردو پڑھاتا تھا۔ چونکہ میں نے اطالوی زبان سیکھ لی تھی اس لئے سٹوڈنٹس کو اردو سیکھانے میں بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی میں مجھے سر پر کا وقت ہو جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا میں یونیورسٹی کے کینے میرا میں ہی کھاتا۔ جس بلڈنگ میں میرا فلیٹ تھا وہ یونیورسٹی کیمپس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میرے پاس ایک ہی کمرہ تھا جس کے کونے میں بڑے لگا تھا۔ ساتھ ہی ہاتھ روم تھا۔ گھڑی عمارت کی کچھیں طرف ایک جھوٹی سڑک پر کھلتی تھی۔ یہ سڑک چھوٹے چھوٹے گول پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھی ذرا آگے جا کر یہ عجیب میں اتار جاتی تھی۔ اس کی دونوں جانب پرانے زمانے کے رمانٹی فلیٹ تھے۔ یہاں اطالوی عورتوں نے گیلریوں میں پھول دار کھلے سجائے ہوئے تھے۔ یہ ایک گلی

ہی تھی۔ اطالوی غور تیس بہت زیادہ باتیں کرتی ہیں۔ وہ ٹیکریوں میں آکر بیٹھ جائیں اور آپس میں اونچی آواز میں باتیں کرنے لگیں۔ میں کبھی بند بھی کرتا تب بھی مجھے ان کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ گلی میں مکانوں کے دو مہمان کاروں پر گیلیے کپڑے سکھانے کے لئے ڈال دیے جاتے تھے۔ ہوا چلتی تو یہ کپڑے خوب ہموار ہوتے۔

اس گلی کے آگے ایک کھنچا ہوا تھا جہاں تین اطراف میں قدیم رومن بادشاہوں کے زمانے کی تاریخی عمارتیں تھیں۔ ایک کشادہ سڑک ان کے درمیان سے گزر کر شہر کے مشہور دریا ٹامبر کی طرف لگی جاتی تھی۔ اس دریا نے تاریخ کے کئی دور دیکھے ہیں۔ دریا کے کنارے اونچے اونچے درخت ہیں جن کی سایہ دار روشوں پر شام کے وقت لوگ چل قدمی کرنے آجاتے ہیں۔ دریا کو ایک پرانے پل پر سے پار کریں تو آگے باتیں ہاتھ کو ایک ٹوٹنا پارک آجاتا ہے اور دائیں ہاتھ کو ایک سڑک غیب میں سے ہوتی ہوئی شہر کے پرانے اور عجیب علاقے کی طرف جاتی ہے۔ اسی سڑک کے ایک چوک میں کتابوں کی دو دکان تھی جہاں ماریا ملازم تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ ماریا کو اسی دکان میں دیکھا۔ ماریا عام اطالوی لڑکیوں کی طرح شرمیل اور نمائش پسند نہیں تھی۔ جسم ڈیلا پڑا تھا۔ بالوں کی مانگ ہماری مشرقی عورتوں کی طرح درمیان میں سے نکالتی اور بالوں کا پیچھے جوڑا بناتی تھی۔ آنکھوں میں ایک اداسی تھی۔ یا مجھے اس کی آنکھیں اداس لگتی تھیں۔ میں اس جذبے کا پورا تجزیہ نہیں کر سکا۔ میں ایک ماڈرن اطالوی رسالے کی تلاش میں اس کی دکان میں گیا تو پہلے ہی کلاؤن پر ماریا نے مسکراتے ہوئے ایک خوش اخلاق دکاندار کی طرح میرا استقبال کیا اور اطالوی زبان میں مجھ سے کہا۔

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

میری گوری رنگت اور وضع قطع سے اس نے مجھے اطالوی سمجھا تھا۔

جب میں نے اطالوی زبان میں ہی اس سے بات کی تو اس نے لبوں پر ہلکی سی

مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا۔

”سینورا! تم اطالوی نہیں لگتے۔ کیا تم ہسپانوی ہو؟“

میں نے جتے ہوئے کہا۔

”میں پاکستانی ہوں۔ پاکستان سے آیا ہوں اور یہاں یونیورسٹی میں

اردو پڑھتا ہوں۔ اردو ہماری قومی زبان کا نام ہے۔“

ماریا نے گروں کو ذرا سا جھکا کر جیسے میری تعظیم کی اور مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں نے اطالوی رسالے کا نام لے کر کہا کہ یہ رسالہ مارکیٹ میں کہیں نہیں مل رہا۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ ماریا کی نگاہیں کلاؤن پر اور کلاؤن کے پیچھے لگے ہوئے رسالوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سر کو انہی میں ہلاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”سینورا! یہ رسالہ ہمارے ہاں بھی آتے ہی ختم ہو گیا ہے۔ میں

کوشش کروں گی کہ آپ کو رسالہ مل جائے۔ کیا آپ کل اسی

وقت آ سکتے ہیں؟ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو یونیورسٹی پہنچا

دوں۔ ہمارا آدنی دن میں ایک یونیورسٹی کا چکر لگاتا ہے۔“

تم تو جانتے ہی ہو میں آرام طلب قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ مجھے یہاں رسالہ پہنچا دیا جائے۔ ماریا نے کارڈ لے کر رکھ لیا۔ میں نے اس کا شکر ادا کیا اور دکان سے باہر نکل آیا۔ ماریا ایک دوسرے جاگہ سے باتیں کرنے لگی۔ دکان کے پل تک آتے آتے ماریا کا خیال میرے دماغ سے اُگل گیا تھا۔

دوسرے دن میں یونیورسٹی گیا تو میری میز پر وہ اعلیٰ درجہ کا رسالہ پڑا تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میرے ساتھ ہی پروفیسر نے بتایا کہ پرائیویٹ کی دکان سے ایک لڑکا آکر دے گیا ہے۔ پرائیویٹ پرائیویٹس اس دکان کا نام تھا جہاں ماریا ملازم تھی۔ میں نے بڑے شوق سے رسالہ کھولا۔ رسالے کے پہلے صفحے پر درود کاغذ کی چھوٹی سی چٹ لگی تھی جس پر اعلیٰ درجہ کی زبان میں لکھا تھا۔

”سینورا! رسالے کی قیمت میں نے ادا کر دی ہے۔“

”نیچے ماریا جرات لکھا تھا۔ یہ ماریا کا پورا نام تھا۔“

میں نے اسی وقت ڈائریکٹری میں سے پرائیویٹس کا نمبر نکال کر ماریا کو فون کیا۔ میں اس کا شکریہ بھی ادا کرتا چاہتا تھا اور اس رسالے کی قیمت بھی ادا کرتا چاہتا تھا۔ فون ماریا نے ہی اٹھایا۔ میں نے ماریا کو اپنا نام بتایا اور رسالے کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔

”میں رسالے کی قیمت ادا کرنے دوپہر کے بعد آؤں گا۔“

ماریا کہنے لگی۔

”سینورا! دکان پر ضرور آئیں۔ مگر قیمت ادا کرنے کی ضرورت

نہیں۔ وہ تو میں ادا کر چکی ہوں۔“

میں نے کہا۔

”مگر میں تم پر یہ بوجھ کیوں ڈالوں؟“

ماریا کی آواز آئی۔

”سینورا! تم ہمارے پاکستانی سہارا ہو۔ اس دفعہ تو میں رسالے کے

پہے نہیں لوں گی۔ یہ میری طرف سے خیریت ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے فون بند کر دیا۔ جانے کیوں اس لمحے میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ماریا کو اتنی جلدی ملی فون بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ مجھ سے مزید باتیں کرتی۔ میں زیادہ دیر تک اس کی آواز سنتا۔ خدا جانے میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے ماریا سے محبت وغیرہ بالکل نہیں تھی۔ اس قسم کا خیال بھی میرے دل میں کبھی نہیں آیا تھا۔ میں نے اس آرزو کو ذہن سے جھٹک کر نکال دیا اور رسالے کا مطالعہ کرنے لگا۔ میں نے ماریا سے کہا تھا کہ میں رسالے کی قیمت ادا کرنے دوپہر کے بعد اس کی دکان پر آؤں گا۔ مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کیونکہ ماریا نے قیمت ادا کر دی تھی اور مجھ سے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب دوپہر کو میں کینے ٹیریا میں کھانا کھانے کے بعد یونیورسٹی کے وسیع و عریض باغ کی ایک بوٹ پر مہاجرین کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بیٹھا سستا رہا تھا تو میرے کانوں میں ماریا کی آواز آئی۔

”سینورا! دکان پر آپ ضرور آئیں مگر قیمت ادا کرنے کی ضرورت

نہیں۔۔۔“

مجھے بے اختیار حسیب جالب کی منزل کا ایک مصرعہ یاد آئی۔

بہر دل سے آ رہی ہے خدا اس گلی میں چل

میں اس وقت کی اپنی بقیاتی کیفیت پر غور کیا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میرا دل محبت کے جذبات سے خالی تھا۔ ایک دوپہر میں اس گلی میں سے گزر چکا تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ میرے دل پر میرے ذہن کا غلبہ ہے۔ میرے دل کی باگ بیشہ میرے دماغ کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بری بات نہیں ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ کم از کم میرے لئے یہی بات اچھی ہے۔ میں نے ماریا کے پاس جانے کا خیال دل سے نکال دیا اور آنکھیں بند کر کے لاہور میں اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگا۔

ایک جبرے ہوئی چار شور مچاتا میرے اوپر سے گزر گیا۔ اس کے شور سے میرے تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں اٹھا اور واپس یہ نور مٹی کی طرف چل پڑا۔ ابھی میرا ایک لپکچر رہتا تھا۔ لپکچر ختم کیا تو دوسرے کے (دھاتی بج رہے تھے۔ میں نے رسالہ برط کیس میں رکھا اور یہ سوچ کر اپنے قہقہے کی طرف روانہ ہو گیا کہ وہاں جا کر اطمینان سے اپنی پسند کا مضمون پڑھوں جب قہقہے میں آکر میں نے کافی بنا کر کھجور کے پائس تپائی پر رکھا اور لیٹ کر رسالہ پڑھنے لگا۔ پیچھے جو گلی تھی وہاں سے دو اطالوی عورتوں کی اور مٹی کی آواز میں بائیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک عورت نے قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لٹا خاموش ہوئی تو میرے کانوں میں ماریا کی آواز آئی۔ یہ آواز اس بار سرگوشی میں قہقہے سے بڑے رازدارانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”میرے بعد ضرور آتا۔ میں انتظار کروں گی۔“

میں نے کافی کا گھونٹ پی۔ مک تپائی پر رکھا۔ رسالہ بند کر کے ہنسنے لگا اور اٹھ کر سیدھا غسل خانے میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر ہاتھ کو اچھی طرح سے ستھارا۔ دوسرے کپڑے پہنے۔ قہقہے کا دروازہ لاک کیا اور میز پر اتر کر نیچے سڑک پر گیا۔

میرے قدم اپنے آپ قدم رومن عمارتوں والے چوک کی طرف اٹھ رہے تھے۔ چوک میں ٹریفک جاری تھی۔ مگر یہ چوک اتنا بڑا تھا کہ میں چلتی ٹریفک میں بھی بڑی آسانی سے چوک عبور کر کے ڈاکٹر ٹائون کو جاتی سڑک پر نکل آیا۔ یہاں سے سڑک کا خمیسا شروع ہو جاتا تھا۔ چوک کے کونے پر ایک چھوٹا سا بوڑھا باہر کو نکلا ہوا تھا جس پر انگریزی میں پڑا تھا بکس لکھا تھا۔ اس دکان کے قریب پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل کی دھڑکیں بگڑ چکی ہیں۔

چھوٹے چھوٹے چھوٹے گھر کے سب سے بڑے شہ پاتھ پر چلتے پھرتے میں دکان کی دکان کے شوکیں کے ساتھ لگ کر رک گیا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن کا

بازرہ لیا۔ دل کی دھڑکن معمول پر آگئی تھی۔ مگر میرا دل زور زور سے کیوں دھڑکنے لگا تھا؟ میں نے سوچا۔ اس خیال پر کہ کہیں مجھے ماریا سے محبت تو نہیں ہو گئی۔ مجھے ابھی آگئی۔ میں نے اپنے جذبات اور ذہنی کیفیات کا جائزہ لیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے دل کے ایک دم تیز دھڑکنے کی وجہ محبت نہیں بلکہ ایک قسم کا خوف تھا یا کسی خوف کا احساس تھا۔ میں نے فوراً دل کو اپنے دماغ کے حوالے کر دیا اور ماریا کی دکان کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

ماریا نے مجھے دکان میں داخل ہونے دیکھ لیا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر کسی کے ساتھ لیل فون پر بات کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنے سر کو ذرا مٹکا دیا۔ جب میں اس کے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ اس دوران لیل فون بند کر چکی تھی۔ ہنس کر کہنے لگی۔

”مینورہ اپلیز مجھ سے رسالے کی قیمت کی بات نہ کرنا۔“

میں نے اپنے دل کا بازرہ لیا۔ سب خیریت تھی، دل معمول کے مطابق دھڑک رہا تھا۔ میں اسی طرح دھڑکتے رہتا۔ میں نے اپنے دل کو حکم دیا۔ میں کوئی رائیگاں یا بھون نہیں ہوں۔ میں نے جیب سے بڑھ نکالا کہ رسالے کے پیسے کم از کم پینٹی ہی کروں۔ یہ میرا اخلاقی فرض بھی تھا۔ ابھی میں مذہ کھول ہی رہا تھا کہ ماریا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ماریا کا ہاتھ گرم تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ ماریا نے کہیں یہ نہ سوچا ہو کہ رواجی عاشقوں کی طرح اس کے سامنے آنے سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ میں نے ہاتھ سمجھ لیا اور کہا۔

”آج سردی ہے۔“

حالانکہ اس روز موسم خوشگوار تھا اور رات بھر جو ٹھنڈی ہوا چلتی رہی تھی اس کا زور ختم ہو چکا تھا۔ پھر میں فوراً اصل موضوع پر آ گیا۔

”نہیں نہیں مینورہ ماریا! یہ پیسے رکھ لو۔ میں تم پر بوجھ نہیں ڈالتا

چاہتا۔

مارسیا کا چہرہ شہید ہو گیا۔ وہ کٹھن ٹرپ بے ترتیبی سے پڑی کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پیری طرف دیکھا اور بولی۔
”سینورا! میں رسالے کی قیمت وصول نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔“

اور وہ کتابوں کو سینے میں مصروف ہو گئی۔ میں کچھ کھینکا سا ہو کر مسکرائے اور ہاتھوں کو زور زور سے رگڑنے لگا۔

”تھینک یو تھینک یو سینورا۔“

اس کے بعد مارسیا نے میری طرف توجہ نہ دی۔ وہ ایک خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس کو شیفت میں سے کتابیں نکال کر دکھانے لگی۔ میں چپکے سے وہاں سے چل دیا۔ اپنے کلیٹ تک میں یہی سوچ سوچ کر دل میں شرمسار سا ہوتا رہا کہ میں نے مارسیا کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خشک کیوں کیا؟ مجھے اس سے ملنے کا کوئی بہانہ چاہیے تھا تو یہ کہہ دیتا کہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمہارا شکریہ ادا کرنا چلوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ ہم لوگ کچھ زیادہ ہی جھوٹ بولتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہمارا جھوٹا رکھ رکھاؤ اور تکلفات جھوٹ کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اب مجھے ایک مچھتاوا سا لگ گیا۔ ضمیر میں ایک غلغلہ سی پھینے لگی۔ بار بار یہ خیال آتا کہ مارسیا پر میرا اثر کچھ اچھا نہیں پڑا۔ وہ میرے بارے میں پاکستانیوں کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ کہ پاکستانی اس قسم کے بنیادی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے رسالے کی قیمت ادا کرنے کے لئے یونہی ہڈ بھول دیا تھا۔ اصل میں مجھے معلوم تھا کہ مارسیا رقم نہیں لے گی اور میں رقم ادا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ میری منافقت تھی یا اسے تم پوچھ سکتے ہو۔ یہ پوچھ سکتی ہمارے پاکستانی معاشرے کی رگوں میں دوڑتی پھر رہی ہے۔ ہم روز اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں اور کبھی دل میں غلغلہ تک محسوس نہیں کرتے۔ مگر مارسیا ایک صاف

نواب ضمیر والی لڑکی تھی اس کے آگے میں نے ایسی حرکت کی تو مجھے اس پر کرسی کا زیادہ احساس ہوا اور میرے ضمیر نے بھی جھکی سی ملامت کی۔
میرے دل میں ابھی تک مارسیا کے لئے محبت و عقیدے کے جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بس میں اپنے ضمیر کی غلغلے مٹانے اور اس کے دل میں پاکستانیوں کے بارے میں جو تاثر پیدا ہو چکا تھا اسے دور کرنے کے لئے ملنا چاہتا تھا۔

مجھے بہت جلد ایک سہری موقع مل گیا۔ ایک ملتے جلتے بعد یوم پاکستان تھا۔ بس نے یونیورسٹی کے کیفے ٹیرا میں اس قومی تقریب کو منانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس تقریب میں رومانیوئرسٹی کے پروفیسروں اور میرے چند ایک پاکستانی دوستوں اور ان کی فیملیوں نے شرکت کی۔ مارسیا کو میں نے خاص طور پر خود باکرہ دعوت دی۔ وہ بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

”پروفیسور! میں ضرور آؤں گی۔“

تقریب سادہ مگر بڑی پڑاوار تھی۔ روم میں منیم میرے دوست اور ان کے بیوی بچے خاص پاکستانی لباس پہن کر آئے تھے۔ کچھ خواتین مندرجی لباس میں ملبوس تھیں۔ کچھ نے بھابی اور بھائی لباس پہن رکھا تھا اور کچھ بلوچی عورتوں کے روایتی لباس میں تھیں۔ میرے کچھ دوست بھی مندرجی ’بھائی‘ بھابی اور بلوچی لباس میں آئے تھے۔ پاکستان کے ملی گیت بچوں نے مل کر گائے۔ میں نے پاکستان کے قیام کی اہمیت اور اس کے سیاسی پس منظر پر ایک تقریر کی۔ یہ تقریر اطالوی زبان میں کی تاکہ وہاں کے دانشور پوری طرح سمجھ جائیں کہ پاکستان کا قیام کیوں ضروری تھا۔ کیفے ٹیرا میں قائد اعظم کی ایک تصویر میں نے اپنے ایک دوست کے گھر سے منگوا کر رکھی تھی۔

مارسیا اس تقریب سے بڑی متاثر ہوئی۔ پاکستان کے مختلف صوبوں کے کھڑقل لباسوں اور پاکستانی خواتین نے بھی اسے بڑا متاثر کیا۔ مجھے کہنے لگی۔

”سینورا۔“

میں نے اس کی بات کاٹے ہوئے کہا۔
 ”مارسیا! تم مجھے پروئے سور کہا کرو۔ تمہارے منہ سے مجھ سے یہ لفظ اچھا لگتا ہے۔“
 وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں تو پروئیسور! پاکستان بڑا کھر قل ملک ہے۔ تمہارے ملک کی خواتین بیوی خوبصورت اور خوش اخلاق ہیں۔“
 ”اور پاکستانی مردوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“
 میں نے شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے پرچھال مارسیا نے ہلکا سا ہنسنے لگا کر کہا۔

”پاکستانی اپنے ملک سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔ جن لوگوں کو اپنے ملک سے محبت نہیں ہوتی۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

اس کے ہاتھ میں منڈے کو کا کولا کا گلاس تھا۔ ہم باتیں کرتے اونچی عراب دار کھڑکی کے پاس آگئے۔ مارسیا کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دور عمارتوں کے پیچھے سینٹ ہال کے گرجے کا گنبد کا اوپر کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”یہ شہر بھی ایک ملک تھا۔ یہ ملک میرا اور میرے اجداد کا ملک ہے۔ آج سے سینکڑوں برس پہلے میرے آباؤ اجداد یہاں آئے تھے۔ اس وقت یہاں اومبارڈوں کی حکومت تھی۔ روما کی سلطنت مقدس سلطنت تھی۔ اس زمانے میں یہ سلطنت مذہب اور سیاست میں تقسیم ہو گئی۔ یہ دونوں طاقتیں اپنی اپنی جگہ پر بڑی مضبوط تھیں۔ یہ خانہ جنگیوں کا دور تھا۔“

مارسیا نے میری طرف دیکھا اور بولی۔
 ”خانہ جنگی بعض ملکوں کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ ایسے ملکوں

میں میرے ملک کا بھی ایک صدی پہلے تک یہی حال تھا۔“
 لیٹیورنٹی کا فرکس کا اظہاری پروئیسور آتھر ورک ہمارے پاس مسکراتے ہوئے آیا۔ وہ مجھ سے غلط ہو کر بولا۔

”پروئیسور! شفاق! میں ایک بار پھر تمہارے ملک پاکستان کے یوم آزادی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ تمہارا تاجدار عظیم ایک گریٹ لیڈر تھا اور تمہاری قوم۔“

وہ ایک لمبے لمبے لئے چپ ہو گیا۔ جیسے اسے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ پھر جنگی ہیناکرا انگلی کا اشارہ میری طرف کر کے بولا۔
 ”تمہاری قوم مارشل قوم ہے۔ تم قدیم رومن قوم کی طرح بہادر قوم ہو۔“

وہ مارسیا کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اس سے تعارف چاہتا ہو۔ میں نے مارسیا کا تعارف کرایا تو اس نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مارسیا سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

”تمہاری دکان پر ٹھیلو کلیں پر لکھی ہوئی ویٹرو پیٹانی کی کتاب آ ضرور ہوگی۔“
 مارسیا نے کہا۔

”میرا خیال ہے ضرور ہوگی۔“

”اوکے۔“ پروئیسور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں کسی دور ضرور آؤں گا۔ تمہاری دکان میں نے دیکھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں بھی وہاں دیکھا ہے۔“

پھر اس نے مجھ سے دو ایک باتیں کہیں اور مارسیا کی تعظیم میں ذرا سا سر جھکا کر چلا گیا۔ مارسیا کہنے لگی۔

”ہماری قوم کے بارے میں یورپ میں مشہور ہے کہ اٹلی کی مورٹس باتیں بہت کرتی ہیں۔ یقین کرو یہاں کے مرد بھی بڑی باتیں

کرتے ہیں۔ باتیں کرنے والی قومیں دس کی بڑی صاف ہوتی ہیں۔ کشادہ ہوتی ہیں۔ انگریز خاموش رہتا ہے اور وہ کشادہ خطرناک ہے اس کا تجربہ تو ہم لوگوں کو بہت ہو چکا ہے۔"

مارسیا ہاتس کرتی مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ایک خاص کشش ہے۔ آواز بڑی اہم چیز ہے اسے مزید۔۔۔ تم بھی ریڈیو سنے آ رہے ہو۔ میں بھی ریڈیو کا آ رہی ہوں۔ ہم دونوں آواز کی اہمیت کو بڑی اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر عورت کی آواز کا ایک بالکل الگ اثر ایک بالکل الگ سماج کا لونی ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ مارسیا کی مسکراہٹ میں ایک خاص بات تھی۔ وہ خاص بات یہ تھی کہ مسکراتے وقت وہ اپنے خوبصورت ناک کو تھوڑا نیچا لیتی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ ایسا جان بوجھ کر کرتی ہو۔ ہوسکتا ہے یہ خود بخود ہوتا ہو۔ بہرحال یہ بات مجھے اچھی لگی اور اس کا بھی مجھ پر اثر ہوا۔

میں نے اشتقاق سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہوگئی تھی۔“

نہیں نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ کہ از کم اس وقت تک نہیں تھی۔ بعد میں ایسا غرور ہو گیا تھا۔ اسی لئے میں انہیں یہ داستان منزل پہ منزل سنا رہا ہوں۔ بس تم سنتے جاؤ۔ بیچ میں بولامٹ۔ نہیں تو میں بھول جاؤں گا اور میں انہیں پوری تفصیل کے ساتھ یہ داستان سنائی چاہتا ہوں۔ یہ دیو داس کی طرح کوئی اتنی بڑی سربجی نہیں ہے۔ ماریسا ابھی اٹالیہ میں ترحہ ہے۔ اگرچہ ہسپتال میں ہے اور اس کی یہ حالت میرے غم میں نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس داستان میں ایک ایسی پہلی اوا سی سی ہے جو مجھے پسند ہے اور مجھے یقین ہے کہ انہیں بھی پسند آئے گی۔ تو میں انہیں رومیا یونیورسٹی میں ماریسا سے اپنی پہلی تفصیلی ملاقات کا حال سنا رہا تھا جب میں نے وہاں یوم آزادی پاکستان کی تقریب پر اسے پایا ہوا تھا۔ یہ تو مجھے اس کی گفتگو سے پتہ چل ہی گیا تھا کہ

اس کا تعلق روم کے ایک قدیم خاندان سے تھا جو صدیوں سے وہاں آباد تھا مگر جس کا جاہ و چشم وقت کی دست برد سے ختم ہو چکا تھا۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ماریا کا رجحان شناسیت پرستی کی طرف ہے اگرچہ شہنشاہیت کو روم میں ختم ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ اس اعتبار سے وہ مسولینی کو پسند کرتی تھی۔ اگرچہ اس کا اظہار اس نے دبی زبان میں ہی کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ ختم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور انکی میں مسولینی کی فاشٹ پارٹی کا ذکر نفرت سے کیا جاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ مسولینی نے ملک کو جاہ کر دیا اور اس کو جرموں کے ہاتھوں بچ رہا تھا۔

مارسیا سے میری یہ ملاقات یادگار ملاقاتوں میں سے ہے۔ اس ملاقات میں ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ جبہ میں مارسیا کو رخصت کرنے کے لیے میری کی لابی تک آیا تو میں نے اس سے اس کی رہائش کے بارے میں پوچھا۔ مارسیا مسکرا دی۔ کہنے لگی۔

”میں اپنے آپ کو ابد کو کے محل میں رہتی ہوں۔ تم آؤ گے تو تمہیں

اپنے محل کی شدت میں اور تاج و تخت دکھاؤں گی۔“

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”مگر مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ یہ کھل کہاں ہے؟“

... مارسیا نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”میرا شاعری رتھ شمس لیٹے آئے گا۔“

اور وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ ماریا کو رخصت کرنے کے بعد میں دو مہرے مسلمانوں سے ہاتھیں کرنے اور ان کی خاطر ہمدردی میں لگ گیا۔

ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ مجھے مار-یا کا ہر دم خیال رہنے لگا ہو یا اس کے ساتھ عاشقانہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو۔ پستے میں ایک آٹھ بار اس کا فون آچاتا۔ رکھی سی بات جیت ہوئی۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ

وہ مجھے ایک پرنسپل دوست کی طرح اچھی لگنے لگی تھی اور جب اس کا فون آتا یا کسی روز اس سے مختصر سی ملاقات ہو جاتی تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔

ایک روز اس کا فون آیا۔ کہنے لگی۔

”آج تم میرے محل میں میرے ساتھ چائے پیو گے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔

”تمہارا رتھ کس وقت مجھے لینے آئے گا۔“

دوسری طرف سے مجھے ماریا کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ کہنے لگی۔

”میں خود رتھ لے کر آؤں گی۔ تمہیں شام پانچ بجے کہیں جانا تو

نہیں؟“

میری وہ شام خالی تھی۔ خالی نہ بھی ہوتی تو ماریا ایسی خاتون کے لئے

میں اپنی دیگر مسووفات مسووخ یا ملتوی کر دیتا۔ میں نے کہا۔

”نہیں! آج اتفاق سے میری شام بالکل خالی ہے۔“

وہ دوسری طرف سے ماریا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

”میں ٹھیک پانچ بجے تمہاری یونیورسٹی میں جاؤں گی۔“

اس وقت دوپہر کے شاید دو اڑھائی بجے تھے۔ اب خدا جانے کیوں مجھے

اس کا انتظار لگ گیا۔ بار بار ماریا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجانا۔ تم

اسے چاہیے دوستی کہہ لو چاہے محبت کہہ لو۔ ہر حال میں بڑی بے چینی کے

ساتھ شام کے پانچ بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک پانچ بجے میں یونیورسٹی کے

پورچ کی محراب کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں وقت کی

بڑی بائدگی کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک منٹ بھی نہیں گزرا ہو گا کہ ایک عینسی

گیت میں داخل ہوئی اور ایک طرف جا کر رک گئی۔ ماریا عینسی سے نکل

کر میری طرف آئی۔ میں بھی مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ہم نے ایک

دو مہرے سے ہاتھ ملایا۔ اس وقت میں میرا ہاتھ ماریا کے ہاتھ کے مقابلے میں

تھوڑا تھوڑا ٹھنڈا تھا۔ یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ کیا میں تیرہ برس تھا؟ ماریا نے

ساتھ میں عینسی میں بیٹھ گیا۔ عینسی شہر کی کشادہ سڑکوں والے علاقے سے نکل

کر دہرائے ٹاؤن کے ساتھ ساتھ چلتی پرانے زمانے کی دیوہیکل عمارتوں والی

بستی میں داخل ہو گئی۔ یہ نیم پھاڑی علاقہ تھا۔ گلیاں جھوٹی جھوٹی تھیں۔

چنانچہ ہم نے عینسی چھوڑ دی تھی اور پتھریلی گلیوں میں پیدل چل رہے تھے۔

میں نے ماریا سے فریاد پوچھا۔

”تمہارا محل ابھی تک نہیں آیا۔“

وہ ہنس دی۔ بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”وہ سناتے میرا محل ہے۔“

یہ ایک دو منزلہ قدیم رہمن حویلی تھی جس کی دیوڑھی کے آگے دونوں

جانب منگ مرمر کے چوڑے بنے ہوئے تھے۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔

مکانوں کے اندر سے عورتوں کے ہلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ حویلی کی

دیوڑھی میں دو اونچے ستون تھے۔ جن پر ایک تیل چڑھنے کی کوشش کر رہی

تھی۔ یہاں مرطوب ٹھنڈک تھی۔ دیوڑھی میں سے ایک نیم تاریک رینہ

دو سری منزل کو جاتا تھا۔ ماریا دو سری منزل کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔ یہ

کمرہ کافی بڑا تھا۔ چست اونچی تھی۔ دو لمبی کرسیاں تھیں جو گلی میں کھینچی گئیں۔

ان پر پروے گرے ہوئے تھے۔ ماریا نے ایک کرسی کی کا پیرہ بٹا دیا۔ پھر بھی

کمرے میں دو عینسی نہ ہوتی تو اس نے جی جلا دی۔ پردہ ڈال کر کمرے کو دو

حصوں میں تقسیم کر دیا ہوا تھا۔ ایک حصے میں فائینک ٹیبل لگی تھی۔ ساتھ

جی ایک پرائیویٹ سیٹ پڑا تھا جس کا رنگ اڑچکا تھا۔ دو سری طرف پر دے

کے پیچھے ماریا نے اپنا بستر لگایا ہوا تھا۔ لیکن رینے کے پاس ہی تھا۔

میں چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ اس کمرے میں لگی ہوئی دو چار

پرانی روٹنی تصویریں اور نوادرات تھے۔ دیوار پر ایک جگہ ڈھال اور تلواریں

لگی تھیں۔ کونے میں ایک پرانے زمانے کے میزبے کے اوپر سرخ رنگی دیوار

بندھا ہوا تھا۔ میزوں اور کارٹن پر تانبے کے پرانے نقش پرانے تھاپیاں اور

ایک گھدان پڑا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ماریا نے جو ایک معمولی سی جاب کرتی ہے۔ اسے اتنے قیمتی فوائد کہاں سے اکٹھے کر لے ہیں۔ جب میں نے اس بارے میں سوال کیا تو وہ میز پر چائے کا سا لمان لگاتے ہوئے ہنسی اور کہا۔
 ”یہ سب اصل کی نقل ہے۔ صرف وہ جو کارٹس کے درمیان میں تائبے کا گھدان ہے وہ اصلی ہے اور ہمارے خاندان میں اب تک چلا آ رہا تھا۔ میرے والد اسے بھی بیچنے لگے تھے کہ میں اسے لے کر دو سرے شہر اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی گئی۔ اس طرح میں نے اپنے پوڑنا خاندان کی اس آخری نقاشی کو بچالیا۔ اس کے غرض مجھے بھاری رقم کی بخشش بھی ہوئی ہے مگر میں نے اسے فروخت نہیں کیا۔“

میں دیر اور لمبی آنکھیں میسنگر نو دیکھنے لگا۔ ان میں ایک تصویر اٹلی کے ایک ماسٹر پیکٹر کی بنائی ہوئی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ ماریا کی پیچھے سے آواز آئی۔

”یہ بے شک بھی اصل کی نقل ہے۔ اس قسم کی تصویریں یہاں عام مل جاتی ہیں۔“

کارٹس کے کونے میں چھوٹے سائز کی ایک رنگین تصویر بھی ہوئی تھی۔ یہ بڑی بڑی مونچھوں اور بھری ہوئی داڑھی والے ایک بوڑھے شخص کا پورٹ تھا۔ جس نے سر پر خوب پن رکھا تھا۔ اس تصویر کے رنگ پچھلے پڑ چکے تھے اور جگہ جگہ خراشیں اور لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ماریا سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا تو وہ میرے قریب آگئی۔ کہنے لگی۔

”یہ شارل آسٹو پوڑنا میرے دادا کے والد کا پورٹریٹ ہے۔ یہ جوئی ان کے دادا نے بنوائی تھی۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب فریڈرک بار ہاروسا شہنشاہ بنا تو وہ امراء اور روساء جو ہنرات کے زمانے میں شہر سے باہر اپنے اپنے قلعوں میں چلے گئے تھے۔ واپس

شہروں میں آگئے۔ یہاں انہوں نے اپنے لئے مکانات اور حویلیاں بنوائیں اور یہیں رہنے لگے۔ ان میں زیادہ تعداد کی ہے لیکن امراء اور جنگ جو شاہ سواروں کی تھی۔ میرے جد امجد کا تعلق بھی شہنشاہیت پسند کی ہے لیکن امراء کے طبقے سے تھا۔ جی بے لین جماعت کو ہارشاہ کی حمایت حاصل تھی۔ میرے دادا کے دادا اسی شہر کے ناظم مقرر ہوئے۔ شہر کے ناظم کو پوڑنا کھانا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارا خاندان پوڑنا خان کے نام سے مشہور ہو گیا۔ مگر میں اپنے نام کے ساتھ پوڑنا نہیں لکھتی۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”اگر تم شہنشاہیت پرست ہو تو پھر اس خاندان کرنے میں کیا حرج ہے؟“

ماریا نے راؤن کٹر کا ایک چھوٹا سا ٹیک ڈو بنایا ہوا تھا۔ اس کے اوپر کریم سے سفید پھون بنا ہوا تھا۔ وہ ٹیک کا ٹرنے میز پر رکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”میں اس نام کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتی۔ میں اطالیہ کے ایسے کئی خاندانوں کو جانتی ہوں جو حقیقت میں پوڑنا نہیں ہیں مگر اپنے ساتھ پوڑنا ضرور لکھتے ہیں۔“

وہ میز کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور ٹیک کے اوپر جو کریم کا سفید پھول بنا تھا اس کی طرف جھری سے اشارہ کر کے بولی۔

”جہانے ہو میں نے یہ سفید پھول کیوں بنایا ہے؟“ میں نے انہیں بتائی ہوں۔ چھوٹیوں صدی عیسوی کے شروع میں ہمارا ملک خونخاک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ دو سیاسی جماعتیں بن گئی تھیں۔ ایک جماعت کو ملت کھاتی تھی اور دوسری جماعت کی بے لین۔ پہلی جماعت عام شہریوں اور مزدوروں، محنت کشوں کی جماعت تھی۔ جبکہ دوسری جماعت کا تعلق امیر طبقہ کے لوگوں سے تھا جو روساء

رہ گئی۔ اس کے چار حصے تھے، تین حصے بک گئے۔ بس یہ ایک چھوٹا سا مکہ میرے پاس رہ گیا ہے۔ اس پر بھی میرا بھائی جو فرائس میں ہے اپنا حق جتنا رہتا ہے۔ کبھی کبھی کرسمس میں اس کا کارڈ آتا ہے تو اس میں لکھا ہوتا ہے کہ میں اس بار آکر خوجلی کے باقی ماندہ حصے کو بھی فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو، تمہیں میں ایک پائلٹ خرید دلاں گا۔“

ماریا خاموش ہو گئی۔ چائے ہلاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”سینور! کیا تمہارے ملک میں بھی بھائی اپنی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟ میں نے تو سنا ہے کہ اوریسٹس میں خاندان کے افراد ایک جہاں ہو کر رہتے ہیں۔“

میں نے اسے پوری تفصیل سے پاکستانی خاندانوں کے آپس میں روابط اور بہن بھائیوں کے پیار، ماں باپ کے ادب گرام اور بزرگوں کے احترام کے بارے میں بتایا۔ وہ جیسے رشک سے مجھے سمجھنے لگی۔

”پر سینور! مجھے تو تمہارے ملک میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔“

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ میں اسے جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے مایوس ہونا نہیں دیکھ سکتا تھا۔“



ایک روز ماریا مجھے اپنے آباؤ اجداد کی قبریں دکھانے قبرستان لے گئی۔ یہ قبرستان اپنی پرانی قبروں کے لئے مشہور تھا اور شہر سے دور ایک سکون جگہ پر واقع تھا۔ یہاں بڑی پرانی قبریں تھیں۔ ایک قبر پر 1301ء اس لکھا تھا۔ ساری قبریں شکستہ تھیں۔ ان کی سیلیں اور مجھے ٹیڑھے دھجے ہوئے تھے۔ ماریا پر قبرستان میں داخل ہوتے ہی گہری خاموشی اور لمبی لمبی طاری ہو گئی تھی۔ قبروں کا ماحول ہی ایسا تھا کہ میں بھی خاموش ہو گیا۔ مگر وہ مجھے اونچے اونچے درختوں کے درمیان ہی ہوائی ایک قبر پر لے گئی۔ قبر کتبہ ایک طرف کو بچے جھکا ہوا تھا۔ اس پر لکھے ہوئے لاطینی الفاظ بالکل مجھے نہیں جا رہے تھے۔ جو الفاظ چتر میں کھودے گئے تھے۔ ان کی سیاہی بھی زنجی تھی اور پتھر کے ساتھ پتھر ہو گئے تھے۔ ماریا نے بتایا کہ یہ اس کے دادا کا قبر ہے۔ اس نے مجھے اپنے دوسرے بزرگوں کی قبریں اور ماں باپ کی ریں بھی دکھائیں۔ ماں باپ کی قبریں شکستہ حالت میں نہیں تھیں۔ وہ ایک رے کے چوتھے کے پاس بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ سامنے کا جانب سا پرہیز کے درختوں میں مسائل تک رہی تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے ماں باپ اور خاندان والوں کی یاد میں گم ہے۔ اچانک اس نے تھ سے سا پرہیز کے درختوں کی طرف اشارہ کیا جیسے کسی کو رکھنے کے لئے رہی ہو۔ میں نے سا پرہیز کے درختوں کی طرف دیکھا۔ مگر مجھے وہاں کوئی منظر نہ آیا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”کون تھا؟“

مارسیا کے چہرے پر اور اس منکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔
ایک لمبا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔
”کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ میرے بچے بعد دوہیں اپنی
قبور پر آتی ہیں؟“

مجھ سے اتنا اہم سوال اچانک پوچھا گیا تھا۔ میں مارسیا کو تنکرا رہ گیا۔
کوئی جواب نہ دے سکا۔ مارسیا نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔
”میں نے روحوں کو اپنی قبور پر اترتے دیکھا ہے۔ ابھی ابھی ایک
روح اپنی قبر دیکھنے آئی تھی۔“
”کہاں؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔
”ان درختوں کے پاس۔“

مارسیا نے ساہنس کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے محسوس ہوئے
اگا کہ مارسیا یا تو حد سے بڑھی ہوئی عقیدت رکھنے والی لڑکی ہے اور یا پھر وہ
بکی بکی باتیں کر رہی ہے۔ ساہنس کے درختوں سے قطریں ہٹا کر اس نے
میری طرف دیکھا۔

”تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ میں پاگل ہے کی باتیں کر رہی
ہوں۔ لیکن ابھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ساہنس کے درختوں
والی روح کو بالکل اس طرح دیکھ رہی تھی جس طرح میں تمہیں
دیکھ رہی ہوں۔“

”وہ کس کی روح ہے؟“ میں نے پوچھا۔
مارسیا ایک دو سینٹر خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی۔

”ابھی تک مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ کی بے لین نائنلن کے
ایک ابلی نسب قبیلان کی روح ہے جو شہسوار بھی تھا اور مطلب
بھی تھا۔ اسے مرنے ساڑھے چھ سو برس ہو چکے ہیں۔ مگر اس کی
روح مجھ سے ملنے آئی ہے۔ کبھی چاندنی رات میں میرے کمرے

میں اور کبھی اس قبرستان میں۔۔۔ میں جب کبھی اس قبرستان
میں آتی ہوں تو اسے معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی روح کی شکل میں
مجھ سے ملنے اپنی قبر پر آ جاتا ہے۔ اس کا نام برد تو ہے۔“

مارسیا نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔
”ہر دوسرا میں نہیں جانتی کہ تمہاری شخصیت میں ایسی کونسی بات
ہے کہ میں نے یہ راز تمہیں بیان کر دیا ہے۔ ہر تنو کی روح نے
مجھ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ مگر
میں نے اس سے بھی وعدہ لے لیا تھا کہ زندگی میں یہ راز تم کو کم
ایک آدمی کو ضرور بتاؤں گی۔ جانتے ہو اس کی وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ
تھی کہ میں جانتی تھی کہ میری زندگی میں کبھی نہ بھی ایک مرد ایسا
ضرور آئے گا جس کو میں اپنا ہم راز بتاؤں گی اور پروہی سو وہ مرد تم
ہو۔“

میں شرمسار رہ گیا۔ میں نے کہا۔

”مارسیا! یہ تمہاری مردانی ہے۔ کہ تم نے مجھے اس لائق سمجھا۔“
مارسیا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ گرم تھا اور ذرا سا
کیکاپا کہنے لگی۔

”نہیں سینورا! میں نے اپنے دل کا حال تمہیں بیان کیا ہے۔ میں
نہیں کہہ سکتی کہ مجھے تم سے محبت ہے یا نہیں لیکن اتنا مجھے یقین
ہے کہ وہ تم ہی آدمی ہو جس پر میں نے اپنی زندگی کے سب سے
پر اسرار راز کو ظاہر کرنا تھا اور جس کے لئے میں نے شہسوار بیوٹو
کی روح سے وعدہ لے رکھا تھا۔۔۔“

جب ہم قبرستان سے نکلے لگے تو میں نے شہسوار بروٹو کی قبر دیکھنے کی
خواہش کی جس کی روح بتول مارسیا اسے سننے آئی تھی۔ مگر مارسیا نے مجھے
ساہنس کے درختوں والی قبر کی طرف جانے سے روک دیا۔ میرے لئے مارسیا

ایک پر امرار لڑکی جتنی جا رہی تھی۔ کبھی خیال تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے ج
ہے اور بروہ کی روح اسے ضرور نظر آتی ہوگی۔ کبھی سوچتا کہ ماریا ایک
نفسیاتی کیس ہے۔ وہ ماضی پر مصب اور خیالوں میں رہنے والی لڑکی ہے۔ روح
کے بارے میں وہ جو کچھ جانتی ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جب میں
نے اپنے اس شے کو دور کرنے کے لئے اس سے کہا کہ وہ مجھے بھی بروہ کی
روح دکھائے تو وہ کہنے لگی۔

”وہ تمہیں نظر نہیں آئے گی۔ روح کو دیکھنے کے لئے اپنے مادی
جسم سے باہر نکلتا پڑتا ہے اور تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

میں نے کہا۔

”لیکن تم اپنے جسم میں رہ کر روح کو دیکھتی ہو۔“

ماریا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پر امرار تھی اور ہم قبرستان کے
گیت کی طرف جا رہے تھے۔ کہنے لگی۔

”یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔ میں جب بروہ کی روح کو دیکھتی
ہوں اور وہ مجھ سے باہر ہے تو میں اس کے بروہوں میں دور سے مجھے اشارہ کرتی ہے
تو اس وقت میں اپنے جسم کے اندر نہیں ہوتی۔ میں — یعنی
میری جو روح ہے وہ اپنے جسم سے باہر ہوتی ہے۔“

پھر ایک سوا گھر کر لیا۔

”سیئورا تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔“

اس روز میں برائے دور تک ماریا کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر کافی بنا
کر لی اور نیلی ریڈن پر میوزیکل پروگرام دیکھنے لگا۔ میں نے ماریا کا خیال دل
سے نکال دیا تھا۔ دراصل میں اس جسم کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار لڑکی سے
اپنے آپ کو دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن ماریا نے مجھے اپنی زندگی کا ہم راہ بنالیا تھا۔ اپنی طرف سے وہ
مجھ سے بہت بڑا اعزاز دے چکی تھی۔ جہاں تک میں سوچتا ہوں وہ مجھ سے محبت

کرنے لگی تھی لیکن وہ اپنی محبت کو کسی دوسری روح کے ساتھ منسلک کر رہی
تھی۔ اس کی وجہ وہی ہوتی جاتی تھی۔ اس دوران مجھے جو اس کے ساتھ
تھوڑی تھوڑی محبت ہونے لگی تھی اسے میں نے وہیں روک لیا اور اپنا ہاتھ
پچھے کھینچ لیا۔ ایک تو ویسے ہی میں محبت وغیرہ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا
تھا۔ یہ میری لائن ہی نہیں تھی۔ دوسرے ماریا روحوں کی دنیا میں رہنے والی
لڑکی تھی جو میری نفسیات کو بھی کسی الجھن میں مبتلا کر سکتی تھی۔ پہلے میں
اسے دو ایک فون کر لیا لیکن تھا۔ اب میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ ماریا براہ
مجھے فون کرتی۔ میرا حال پوچھتی اور گھر آکر کافی پینے کی دعوت بھی دیتی۔ میں
کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ اس دوران پوچھو شی میں تعطیلات آگئیں۔

میں ماریا کو بتائے بغیر سیر دیانت کرنے ویش کی طرف نکل گیا۔
ویش لٹالہ کا رہی شہر ہے جس کی گلیوں میں نہریں بہتی ہیں۔ اس شہر کی تاریخ
بھی بڑی دلچسپ ہے مگر اس وقت میں تاریخ کے ادراک میں کھولنا چاہتا۔
ویش میں مجھے والی ایم ی اے کے ہوٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔ میں ناشتہ
کر کے ہوٹل سے نکل جانا اور چھوٹے چھوٹے جڑوں تک ٹاپوؤں پر مشی
ہوئی سنگ مرمر کی حویلیوں اور قدیم سکاؤں کی سیر کرنا۔ گندولہ یعنی کشتی پر بیٹھ
کر ویش کی نہریں گلیوں کی سیریں کرنا۔ دوپہر کو ہوٹل واپس آکر کھانا کھانا اور
تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر نکل جانا۔

ایک روز دھیرے کا وقت تھا۔ ویش شہر میں بڑی خوشگوار چمکیلی دھوپ
نکل ہوئی تھی۔ میں ایک مشورہ میں اپنے لئے ایک جیکٹ دیکھ رہا تھا۔ جیکٹ پر
پھول کچھ زیادہ ہی بے ہوش تھے۔ میں ساوہ جیکٹ چاہتا تھا۔ میں جیکٹ کو
یوگر میں انکانے کے بعد مشورہ کے دروازے کی طرف ہوجا ہی تھا کہ سامنے
ماریا کھڑی نظر آئی۔ میں اسے دیکھ کر واقعی بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ ویش دوم
سے کافی دور تھا۔ میں جہاں ہوا کہ یہ لڑکی یہاں کیسے آئی۔ پھر سوچا کہ ہو سکتا
ہے اپنے کسی کام سے آئی ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ

کہنے لگی۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ وہیں جا رہے ہو مگر مجھے پتہ چل گیا تھا۔“

میں نے کچھ شرمندہ سا ہو کر کہا۔

”میں جلدی میں پروگرام میں گیا۔ تمہیں اطلاع نہ کر سکا۔ تمہیں یونیورسٹی سے پتہ چلا ہو گا۔“

وہ رازداری کے ساتھ میرے قریب ہو کر بولی۔

”مجھے بدلتی روج نے بتا دیا تھا۔ بس اسی وقت میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے یہاں آگئی۔“

میں کچھ گھبرا سا گیا۔ جتنا میں اس لڑکی سے دور رہتا چاہتا تھا اتنا ہی وہ میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے ہکا بکا تقدیر لگایا اور کہا۔

”پلو اچھا ہوا اب اگلے شہر کی سیر کریں گے۔“

شہر کے پہلو میں ایک پرانا سارے شوران تھا۔ ہم وہاں آکر بیٹھ گئے اور کافی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ ماریا پہلے سے عجیبگی اختیار کر رہی ہے۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی شدید ضرورت کے وقت نمودار ہوتی تھی۔ کالی کالک دونوں ہاتھوں میں پکڑے وہ رستوران کے شیشے والے دروازے کے باہر سڑک پر دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی مہذبہ دلی میں عجیب سی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ دل کی چاہتا تھا کہ کوئی ہلکا ہلکا ماریا سے الگ ہو جاؤں مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ اچانک ماریا میری طرف متوجہ ہوئی۔ کہنے لگی۔

”سیوڑ! میں تمہیں اس شہر کی ایک تاریخی یادگار دکھانا چاہتی ہوں۔ کیا میرے ساتھ چلو گے؟“

میں نے سوچا کہ تاریخی یادگار میں تو مجھے دیکھنی ہی ہیں۔ پھر ماریا کے ساتھ چلنے میں کیا حرج ہے۔ میں نے غوثی ہو کر کہا۔

”ضرور چلوں گا۔ یہ کسی قسم کی تاریخی عمارت ہے۔ کیا کوئی پرانا محل یا قلعہ ہے؟“

ماریا نے کبھی بڑے رکھ اور ہنستے ہوئے بولی۔

”یہ تمہیں وہاں چل کر بتاؤں گی۔ بلکہ تم خود دیکھ لو گے۔“

رستوران سے نکل کر ہم ٹیٹ پاتھر پر چلے گئے۔ جہاں سڑک ختم ہوئی وہاں پتھر کا ایک گنڈولا میں سوار ہو گئے۔ گنڈولا یعنی کشتی شہر کی پانی سے بھری ہوئی گلیوں میں چل نکلی۔ ان گلیوں میں ایک ریٹائٹ سمنڈر کا پانی تھا۔ دونوں جانب پتھر کے قدیم مکانات تھے۔ ان کی سنگ مرمر کی بارہ دریاں اور گلیاں ہمارے اوپر چلی ہوئی تھیں۔ سمنڈر کا پانی مکانات کی دیواروں اور میز صوبوں سے نکلا کر پتھروں کے کھانوں پر بہتا تھا۔ ہماری کشتی ایک ٹھک ٹھک میں سے گزر کر دوسری طرف مڑی تو ماریا نے اظہارِ زبان میں مدح سے کہا۔

”یہاں بائیں طرف کشتی روک دو۔“

وہاں بائیں طرف پانی میں ایک چھوٹا سا پرانا مکان تھا۔ جس کے برآمدے کی آٹھی سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ملاح نے کشتی کو میز صوبوں کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ ضرور ماریا کے قیامِ ابد اور کی چھوڑی ہوئی یا فروخت کی ہوئی حویلی ہوگی۔ کیونکہ اس حویلی میں پرانے قلعے یا محل والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم برآمدے میں آگئے ماریا نے حویلی کا ستونوں والا پرانا دروازہ تھا۔ دروازہ کھڑکی کا تھا جو چھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے ماریا سے پوچھا۔

”کیا یہ کسی بزرگ کی قدیم خانقاہ ہے ماریا؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھ کر دروازے کے ایک پت کو اندر کود نکلیا۔ چرخہ اسٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ اندر ایک کشادہ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی کے آگے بھی ایک خرابی دروازہ

تھا۔ جو آٹھ گھنٹہ تھا۔ وہاں سے روشنی آرہی تھی۔ یہ دن نئی روشنی تھی۔
 دروازے کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کے وسط میں ایک فوارہ
 لگا تھا۔ فوارہ ایک بڑے شکل انسان کے جیسے کی شکل میں تھا جس کا رنگ
 نسواری پڑچکا تھا۔ وہ صحن بھی خشک تھا اور کہیں کہیں گھاس لگ رہی تھی۔
 سامنے پھر ایک ستونوں والا دروازہ تھا۔ اسیا مجھے برآمدے میں لے آئی۔ پھر
 اس نے برآمدے کی ایک کونجری کا دروازہ کھول دیا۔ کونجری میں اندھیرا تھا۔
 دروازہ پورا کھلا تو کونجری میں دن کی روشنی داخل ہو گئی۔ اس روشنی میں مجھے
 اس شخص کی کونجری کے وسط میں ایک چتر کا چہرہ نظر آیا جس کے چادروں
 طرف لوہے کے کندے لگے ہوئے تھے۔ اسیا بھونکتے کے عالم میں اس
 چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ سے چہرے کی طرف اشارہ کیا
 اور بولی۔

”مجھے اس چہرے پر لوہے کے کندوں سے ہمدردی کا لہجہ دکھانے کا نشانہ
 دینا جاتا تھا۔ وہ لوگ مسیحی کے حامیوں کو چن چن کر قتل کر رہے
 تھے۔“

ماریا نے جانا کہ جب اتحادی فوجیں اٹلی میں داخل ہوئیں تو ہر طرف
 قتل و خون ریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ مسیحی کو گولی مار کر چوراسے میں کھجے پر
 لٹکا دیا گیا۔ ماریا نے ایک عقلندی کی تھی۔ حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے اس
 نے کسی طریقے سے اپنے ماں باپ کو بھائی کے ساتھ یونان بھیج دیا تھا۔ مگر
 اسے مخالف پارٹی کے آدمیوں نے پکڑ لیا۔ انہوں نے ماریا کو قتل تو نہ کیا مگر
 اسے ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا۔ وہیں میں وہ مجھے ساتھ لے کر خاص طور پر
 وہ نیم تاریک حویلی والا چہرہ دیکھنے آئی تھی۔ کہنے لگی۔

”یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ بہر حال میری زندگی باقی تھی۔ میں بچ
 گئی۔ یہ چہرے مجھے ماضی کے عذاب یاد دلاتا ہے۔ میں جب بھی
 وہیں آتی ہوں تو اس چہرے کو دیکھنے ضرور آتی ہوں۔“

میں تین دن وہیں میں ٹھہرا۔ اس دوران ماریا دوسرے شہر چلی گئی
 تھی۔ واپس روم آیا تو اسے فوج کیا معلوم ہوا کہ وہ ابھی روم واپس نہیں
 آئی۔“

یہاں اشفاق احمد کا اٹالیہ کی ماریا کا روبان ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے
 ساری داستان سن کر اشفاق سے کہا۔

”یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس پر

ایک دل کو گداز کرنے والا ناول لکھتا۔“

اشفاق احمد نے بڑے افسردہ جھیم کے ساتھ کہا۔

”تم تو ناول لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے میں کیا کروں؟“

اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ یہ شخص اندر سے کسی قدر
 خفا اور گمراہ ہے۔ اسے اس لڑکی کا غم تھا مگر یہ غم اس نے مجھ پر بھی ظاہر
 نہیں کیا تھا اور اگر اس روز جب اسے اسیا کا خط ملا اس کے پاس نہ بیٹھا
 ہوتا تو وہ یہ کہانی مجھے بھی نہ سنا۔ میں اسے کروڑ کی ایک غلط سمجھتا ہوں
 اور اشفاق احمد میں یہ غلطی ہو جاتا ہے۔

- زندگی کے ورشتہ پر تصوف کا پھل عام طور پر عمر کے آخری حصے میں
 جا کر لگتا ہے۔ فوجیوں کے زمانے میں مجھے نہیں یاد کہ اشفاق احمد نے مجھ سے
 کبھی تصوف کے موضوع پر کوئی بات کی ہو۔ یہ زمانہ ہنسے کھیلے اور سونے
 اڑانے کا ہوتا ہے۔ البتہ درمیانی عمر میں آکر اشفاق نے تصوف کی باتیں
 شروع کر دی تھیں۔ یہ باتیں کسی ایسے سالک کی نہیں تھیں جو حقیقت کی
 تلاش میں لگا ہو۔ بلکہ ایسے پیر یا صفا کی باتیں ہوتی تھیں جن نے حقائق و
 معارف کی منزل پائی ہو۔ لہذا یہی طور پر وہ کسی ایسے پیر کامل کی تلاش میں تھا
 جو اسے اپنا مرید بنانے کی بجائے پیر کامل بنادے۔ انسان انھوں میں یوں سمجھ
 لیں کہ اشفاق احمد خود پیر بننا چاہتا تھا۔ میرے سامنے وہ تصوف کی باتیں بہت
 کم کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے اس کے تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں ہے

نکڑا اپنے سے علمی اعتبار سے کم تر اور اپنے ماتحت لوگوں میں بیٹھ کر وہ تصوف پر تحقیق تہم کے لیکچر دیتا اور وہ لوگ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلاتے رہتے جو سر مضبوط نہ ہو وہ بڑی جلدی مل جاتا ہے۔

مجھے خبر ملتی رہتی کہ آج اشفاق احمد غالاں پیر کے ڈیرے پر گیا ہے۔ آج غالاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ میں نے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ کبھی بھی وہ خود مجھے بتاتا کہ آج میں غالاں بزرگ کے پاس گیا تھا۔ برسے کمال کا آدمی ہے۔ اس کے ڈیرے پر ہر وقت لشکر کھلا رہتا ہے۔ جو کوئی آئے بزرگ بلایا ہی سب سے پہلے اسے کھانا کھاتے ہیں۔ میں کہتا۔

”منصور وہ بڑے ٹیک نل بزرگ ہیں ان سے فیض حاصل کرو۔“

مجھے معلوم نہیں کہ اشفاق احمد نے کسی بزرگ سے فیض حاصل کیا یا نہیں لیکن وہ بڑے بڑے ہاشما بزرگوں کے پاس دوڑ دوڑ کر جاتا رہا ہے۔ کچھ روز کبھی بزرگ کی مجلس میں بیٹھتا ہے۔ ہر محفل میں اس کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس بزرگ کو چھوڑ کر کسی دوسرے بزرگ کی تلاش میں نکل بکھڑا ہوتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اشفاق احمد کو خود پیر بننے کا شوق ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اسے کسی پیر کی نہیں بلکہ اپنے مریدوں کی تلاش ہے۔ ہر حال یہ اس کا طالعہ ذاتی معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے احمد جے وہ پورا صوفی بن چکا ہو اور اس نے حقیقت کو پایا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی نہیں کی تلاش میں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ نہ اسے حقیقت سے کوئی دلچسپی ہو اور نہ کسی پیر کمال کی تلاش ہو اور وہ محض تصوف پر باتیں ہی کرتی چاہتا ہو۔ اس کا تصوف محض بحث مباحثے اور تصوف کی اصطلاحوں تک ہی محدود ہو۔

اشفاق کو تصوف کی اصطلاحیں بولنے کا بڑا شوق ہے۔ ایک زمانے میں اس کے منہ پر ”تجوید“ کا لفظ بڑا چڑھا ہوا تھا۔ وہ یہ لفظ تصوف کی گنگو کرتے ہوئے بار بار استعمال کرتا۔ میں نے ایک دن پوچھا۔

”یہ تجوید کیا چیز ہے؟“

اس پر اشفاق نے مجھے ایک لیکچر دیا۔ میں پہلے ہی پریشان تھا۔ اس کا پھر سن کر اور پریشان ہو گیا۔ یہ لفظ ”تجوید“ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔

لاہور شہر سے باہر ایک بزرگ راضی سائیں کا ڈیرا تھا۔ اشفاق احمد اس آس اویس کے ساتھ ان بزرگ کی خدمت میں اکثر خاموشی دیتا تھا۔ ان دنوں وہ ان بزرگ کا ہر مجلس میں ذکر کرتا۔ کہیں کوئی فطیہ صدارت پڑھتا تو اس میں بھی اسی بزرگ کا کسی نہ کسی طریقے سے ضرور ذکر کرتا۔ پھر ایک وقت آیا کہ اس بزرگ کے ہارے میں خاموش ہو گیا۔ میں نے بھی اس سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ کیونکہ مجھے اس کی زندگی کے اس پہلو سے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے اس کی دوستی عزیز تھی اور ترجیح بھی ہے۔ وہ مجھے چھانگتا تھا اور آج بھی اسی طرح اچھا لگتا ہے۔ تصوف سے ہٹ کر وہ جس موضوع پر بھی بات کرے میں اس میں بڑی دلچسپی لیتا ہوں۔ اسے شوق سے سنتا ہوں۔ ایک عجیب بات میں نے اشفاق احمد میں دیکھی ہے کہ وہ اپنے احتیوں کے ساتھ اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل کے ساتھ بڑا متفکرانہ سلوک کرتا ہے۔ میں اس نتیجے پر بھی پہنچا ہوں کہ اشفاق احمد کے اندر ایک انذار پسند پروکھٹ یعنی شاہی افسر کہیں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس شاہی افسر نے نہ تو اشفاق احمد کو پورا اویس بننے دیا ہے اور نہ پورا صوفی درویش بننے دیا ہے۔ میں وہ تصوف اور اویس کے درمیان لٹک کر رہ گیا ہے۔ لیکن بیساکہ میں اس نقطے کی باہر مدار وضاحت کر چکا ہوں کہ مجھے اس کی دوستی عزیز ہے۔ میں چونکہ محبت کا آدمی ہوں۔ قدرتی طور پر میرے اندر اشفاق احمد کے لئے محبت پیدا ہو چکی ہے۔ اگر میرے دل میں یہ محبت نہ ہوتی تو نہیں کریں میں اس کا دوست بھی کبھی نہ ہوتا۔ کیونکہ جتنی اس کے اندر کمزوریاں ہیں اس سے دلی میرے اندر کمزوریاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محبت کا جذبہ عطا کر کے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے۔ دوست میں نے جن کو بنایا وہ مجھ سے پرورش ہو گیا لیکن محبت جس سے کی ہے پھر وہ میری محبت کے اثر سے بچ نہیں سکا۔ یہی حال

اشفاق احمد کا ہے۔ جب میں اس کے سامنے جاتا ہوں تو اپنی محبت کو اس کے چہرے پر صاف دیکھ لیتا ہوں۔ اس وقت وہ بالکل بدلا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ میری محبت اس کے دل کے کسی گوشے میں سوئی ہوئی محبت کو بیدار کر دیتی ہے۔ یقین کریں اس وقت اشفاق احمد دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ دوستیاں کر سکتے ہیں جس میں دماغ دماغ سے لڑتا ہے۔ محبت نہیں کرتے جس میں دل دل کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جب کبھی اشفاق احمد سے ملتا ہوں تو میرا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ محبت — محبت — صرف محبت! نہ کوئی غرض، نہ لالچ، نہ لینا نہ دینا۔ اس دیکھ کے خوش ہو جانا۔ باتیں کر کے خوش ہو جانا۔ جتنی دیر ایک دوسرے کے قریب رہنا خوش رہنا، تمنا رہنا، کبیر داس نے شاید اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

دیکھ لینا نہ دینا

تکلیف نہ دینا

دوستی میں اس قسم کی محبت میں نے اشفاق احمد سے پہلے کرم نواز (بعد میں صرف نواز) سے کی ہے اور اشفاق احمد کے بعد کسی سے نہیں کی۔ ہوئی ہی نہیں۔ میں کیا کرتا۔ دوستی کرنا دکان کو سجا کر مال بیچنا ہے۔ محبت کرنا دکان کے مال کو لٹا دینا ہے۔ جیسے جیسے دکان کا مال لٹاتے جاتے ہیں خوشی میں افسانہ ہوتا جاتا ہے۔ منافع بڑھتا جاتا ہے۔ دکان خالی ہوتی جاتی ہے۔ دل بھرنا چلا جاتا ہے۔ چپکلے صفحوں میں میں نے اشفاق احمد کی ہونڈ ایک کمزوریاں یا برائیاں بتائی ہیں تو یہ میرے اندر بھی موجود ہیں اور یہ کمزوریاں مجھے محبت میں نظر نہیں آئیں۔ دوستی کی آنکھ سے دیکھا ہے تب نظر آتی ہیں۔ جب سے لوگوں کو پتہ چلا ہے کہ میں اشفاق پر کتاب لکھ رہا ہوں تب سے شمال، جنوب، مشرق، مغرب سے لوگ آ کر میرے کان بھر رہے ہیں۔ یہ بھی لکھنا کہ وہ — یہ بھی لکھنا — یہ ضرور لکھنا کہ — کوئی میرے پاس نہ آئے۔ مجھے اس کی کوئی برائی یا کمزوری آتا ہے تو میں اسے کہتا ہوں کہ یہ برائی تو

میرے اندر بھی موجود ہے۔ میں کس منہ سے لکھوں؟ اس کی بعض کمزوریاں جو میں نے بیان کی ہیں وہ ایسی ہیں کہ میں اس کے منہ پر بھی کہہ سکتا ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ مجھے کتاب لکھنے کا موقع ملا ہے تو میں اس کی عدم موجودگی میں اس کے بچے چٹھے پھولے شروع کر دوں۔ کون ہے جس میں صیب نہیں ہوتے دیکھنے والی چیز تو یہ ہوتی ہے کہ ایک انسان کے اندر اللہ کی مخلوق کے ساتھ محبت کتنی ہے۔ اشفاق احمد میں لاکھ کمزوریاں سہی، لاکھ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ضابطے کی سخت کارروائی کرے، مگر اس کے دل میں اللہ کی مخلوق کے لئے محبت کا بڑا جتنی سرمایہ موجود ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ "مکڑیا" اور "عصمان بہار" ایسی کمائیاں نہ لکھ سکتا۔

کون لکھتا ہے ایسی کمائیاں؟ کون پڑھتا ہے ایسی کمائیاں؟ میں نے ایک دفعہ اشفاق سے کہا تھا۔ کمائیاں لکھ کر بھول جایا کرو۔ مگر وہ نہیں بھولے۔ اس کے اندر ایک یہ بھی بڑی کمزوری ہے۔ وہ اپنی کمائی کا چھپا کرتا ہے۔ جہاں جہاں کمائی جاتی ہے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔

اس زمانے میں جو کہ لاہور میں شعراء ادب کے عروج کا زمانہ تھا مال روڈ پر ایک چھوٹا سا بڑا رومینک ریسٹوران کھلا تھا جس کا نام بھی فرانسیسی میں شالت یا شالے تھا۔ اب یہ فریج جانے والے جانتے کہ فرانسیسی ہیں اس کا تلفظ کیا ہوتا ہے۔ زبان بھی انسانوں کے درمیان ایک حجاب ہے۔ کیسے کیسے حجاب چھ میں آگن چاہے ہیں۔ بہر حال اس ریسٹوران میں ایک چھوٹی سی شاہ نشین یا ڈبہ نما کمرہ تھا جس کی ایک ہی کمری تھی جو مال روڈ پر تھکی تھی۔ اس ریسٹوران میں جانے کی بجائے کافی ملتی تھی اور کافی بھی برازیل کی — یہ میں سن 1950ء کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت میں نے برازیل کے ملک کو دنیا کے نقشے پر ہی دیکھا تھا اور اس کی کافی ہندوستان کے شہر گوا میں ایک دو بار بیٹھی تھی۔ وہاں یہ کافی پر نگاہی اپنے ساتھ لاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ برازیل میں بھی یہ کافی پر نگاہی کے لوگ ہی لے کر آئے تھے۔ مال روڈ والے شالت کی

کافی کم از کم لاہور کے کافی ہاؤس سے بڑی اچھی ہوتی تھی۔ کافی ہاؤس کی کافی بڑی تھی اور کم تر درجے کی کافی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کافی ہاؤس میں بیٹھے والوں میں کافی کا شعور نہ ہونے کے برابر تھا۔ اگر لاہور کے کافی ہاؤس والے ہندوستان کے شہر مدارس میں جا کر وہاں کے دانش وران کو اپنی کافی پلائے تو انہیں وہ سب سے دن ہی یاد رہا ہسٹر کول کر کے وہاں سے بھاگنا پڑتا۔ کیونکہ مدارس کا قلی بھی ہم سے زیادہ ہسٹر اور اچھی کافی چتا ہے اور کافی کا ہسٹر شعور رکھتا ہے۔ میں چونکہ پاکستان بننے سے پہلے پہلے مدارس اکیر الہ اور گواہ دہن کے ریسٹورانٹوں میں بیٹھ کر مولانا وحار بارش کے پس منظر میں وہاں کی کافی اور کو کو پی چکا تھا اس لئے مجھے پہلے روز سے ہی لاہور والے کافی ہاؤس کی کافی تھی اور غیر معیاری تھی اور سخت مجبوری کی حالت میں وہاں کافی چیا تھا۔ لاہور والے کافی ہاؤس میں اصلی اور نقلی دانشور محض فیض کے طور پر کافی پیچ تھے۔ وہ کافی کو بالکل چاہنے کی طرح پیتے۔ یعنی بیٹھے چن اور کافی پر کافی پئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں سوچتا تھا کہ یہ شربت صرف مرطوب یا سخت سرد ملکوں کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ کافی ہاؤس کے اکثر دانشوروں نے کافی پی پی کر اپنے صدوں کو تباہ کر دیا۔ ناصر کاظمی کو اس کافی ہاؤس کی کافی پی پی کر معدے کا امیر ہوا تھا۔ اگر ہائبرڈ نہ کر رہی ہو اور جنوب مشرقی ایشیا کی موسلا دھار مرطوب موسموں والی بارشیں نہ ہو رہی ہوں تو کافی کے پیالے پر پیالے پئے جانا شراب پینے سے زیادہ خطرناک بات ہوتی ہے۔

میں مال روڈ والے شالٹ ریسٹوران کی کافی کی بات کر رہا تھا۔ اس ریسٹوران کا نام صرف شالٹ تھا۔ ریسٹوران اسے میں نے لکھ دیا ہے۔ یہاں کھانا نہیں ملتا تھا۔ صرف میکس تیار ہوتے تھے اور کافی ملتی تھی۔ مینی اور اشفاق کبھی کبھی اس ریسٹوران میں جا کر کافی پیا کرتے تھے۔ وہ سر دیان ہوں یا گرمیاں وہ یہاں میری ذمہ داری کافی چیتا تھا اور ہم کریم وال کر کافی پیچے

۔ ہمارے شہر کے موسموں کے لئے کریم کافی کا لازمی جز ہے۔ جو دانشوران ان کا خیال نہیں رکھتے ان کی دانش پر میں نے بھی اعتبار نہیں کیا۔ لاہور میں برف تو نہیں گرتی لیکن یہاں سردیوں کی بارش بڑی مایکھ ہوتی ہے۔ مال روڈ والے فرانسیسی شالٹ میں ہم کو شش کرتے کہ وقت کافی چیتے چائیں جب بارش ہو رہی ہو۔ خواہ یہ بارش موسم برسات بارش ہی کیوں نہ ہو۔ برسات کا موسم جنوبی مشرقی ایشیا کے ہاؤس کے لوگوں سے شروع ہوتا ہے۔ وہاں وہ جوان اور سرسبز شاداب ہوتا ہے۔ در تک آتے آتے وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ سنوں نے ملایا تھا لیڈ سگا راکٹوں، کلکتہ اور کوئٹہ کے چٹکوں کی بارشیں دیکھنی ہوتی ہیں وہ لاہور اور جراتوالہ کی برسات کو دیکھ کر صرف آہیں ہی بھر سکتے ہیں۔ مال روڈ والے شالٹ کے کہیں میں ایک لکوی کا ٹکٹ دیکھ جاتا تھا۔ یہ اور اشفاق احمد کہیں کی پھوٹی سی کھڑی والی میر کے پاس بیٹھ جاتے بارش مال روڈ کا نظارہ بھی کرتے اور کریم والی کافی کا بھی مزہ لیتے۔ اس وقت میں کوہ مری کا میز ریسٹوران بہت یاد آتا۔ آزاد کشمیر ریڈیو کے زمانے میں اسے وہاں بر فباری کا ایک سیزن ایک ساتھ گزارا تھا۔ اس وقت پاکستان کی ایک سال سے بھی کم تھی۔ کوہ مری میں اتنی آبادی کہاں تھی۔ گرمیوں میں ڈوڑی دوڑتی ہوتی تھی۔ بر فباری کے زمانے میں تو بالکل ہی خالی ہو جاتا تھا۔ بیماری میں ہم لیے گرم کوٹ پئے چیزیاں ہاتھ میں لئے گرتی بڑت میں لمبی میر کرتے۔ سمیر ریسٹوران کے مالک سلطان صاحب نے خاص طور پر ریسٹوران سردیوں میں بھی کھلا رکھا تھا۔

ایک روز گوہری میں بیٹی قہر دست برف گر رہی تھی۔
 سارے درخت، مکانوں کی چھتیں، سڑکیں برف سے ڈھکی ہوئی
 تھیں۔ سہوئے، نری جہاز مارستوران کے تمام شیشے والی کڑکیاں بند تھیں۔
 میں اور اشفاق لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر دستوران میں آگئے۔ باہر سخت
 سردی تھی۔ برف گر رہی تھی۔ ساتھ ہوا بھی چل رہی تھی جو جڑی جگ آلود
 تھی۔ دستوران کی آغا گرم تھی۔ بخاری میں آگ، لک رہی تھی۔ سلطان
 صاحب حسب معمول اپنی کونے والی سیٹ پر کڑی سے پاس بیٹھے تھے۔ ہمیں
 دیکھ کر سسکائے۔ دور سے ہاتھ کے اشارے سے ہم نے ایک دوسرے کو
 سام کیا۔ ہم دو سرے کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ بند کڑی کے شیشوں پر بھاپ
 جم رہی تھی۔ ہم بار بار وہال سے بھاپ کو صاف کرتے تو سرک کا منظر صاف
 ہو جاتا۔ برہادی میں کوئی کوئی مقامی آدمی لالچی ٹیکٹا سڑک پر سے گزر جاتا۔
 دستوران کے سامنے کوچے ٹیرس پر ایک کونسی کے پہلو میں چھوٹی سی انگلیسی
 تھی۔ انگلیسی کی ڈھلواں چھت مفید برف میں چھپی ہوئی تھی۔ برآمدہ خالی اور
 وہ ان تھا۔ سامنے چھوٹے سے لائن میں بھی برف کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں
 اور اشفاق باتیں کر رہے تھے۔ اگلے میں دیر ہمارے لئے کریم کافی لے گیا۔
 اشفاق کافی پانی لگا۔ میری نگاہیں باز بار ٹیرس والی انگلیسی کی طرف اٹھ
 جاتیں۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے
 وہاں پر ایک لڑکی کو دیکھا تھا جس نے بلو شلوار قمیض کے اوپر سرخ رنگ کا
 ہائ کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آئی تھی۔

ان نے چھوٹی سی نوکری برآمدے میں ستون کے ساتھ رکھی اور برف کے
 چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں کو گرتے دیکھنے لگی۔ پھر وہ جلدی سے کمرے میں
 چلی گئی اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ انگلیسی خالی ہوگی۔ برہادی میں کون پہاڑ پر آتا ہے۔
 مگر لڑکی کو دیکھا تو طبیعت خوش ہو گئی کہ دنیا میں باذوق لڑکیاں ابھی باقی ہیں۔
 میں نے اشفاق کو نہ بتایا کہ ابھی ابھی میں نے وہ ان ٹیرس والی انگلیسی میں
 ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ لڑکی لباس سے پڑھی کھچی لگ رہی تھی اور صاف
 لگ رہا تھا کہ وہ اپنی قبیلے کے ساتھ پہاڑ پر برہادی کا نظارہ کرتے آئی ہوئی
 ہے۔

جس وقت اشفاق نے کافی بنا کر میری طرف بدھائی تو میں اسی ٹیرس کی
 طرف دیکھ رہا تھا۔ اشفاق میری نظروں کو پہچان لیتا ہے۔ اس نے بھی ایک نگاہ
 اوپر خالی ٹیرس پر ڈالی اور پوچھا۔
 "ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "برہادی دیکھ رہا ہوں۔"
 وہ مسکرایا۔ "کیسے ضرور کوئی بات ہے۔ کیا وہاں کوئی لڑکی نظر آئی
 ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس برہادی میں اتنی شدید سردی میں یہاں کون آتا
 ہے۔"

تین اسی وقت وہی لڑکی دروازہ کھول کر وہاں پر آمدے میں آئی۔ اس
 بار اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو بھاری بدن کی تھی۔ اشفاق فوراً
 بولا۔

"کیسے میں نہ گستاخ کوئی بات ضرور ہے۔"
 پھر وہ مجھے ڈانٹنے اور ہدایات دینے لگا۔
 "خیر دار! یہاں کوئی ایسی حرکت کی۔ ہم لوگ یہاں ایک

بھٹل کاڑھ کے لئے کام کرنے آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنے بھٹل
کاڑھ کی اینٹوں کا خیال رکھنا ہو گا۔

میں نے ہلکے آکر کہا۔

”میں نے کسی کا کہیہ نہیں کاٹا۔ برہماری میں ایک کاسی لباس
والی لڑکی کو دیکھا ہے جو مجھے اچھی لگی ہے۔“
اشفاق سر ہلاتے لگا۔

”شروع شروع میں تم یہی کہا کرتے ہو۔ میں تیری ایک ایک رگ
سے واقف ہوں۔“

میں نے گرتی برف کی جھال میں سے ٹیرس کی طرف دیکھا۔ وہاں
دونوں عورتوں میں سے کوئی بھی نہیں تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”غیب تو خوش ہو۔ برآمدہ خالی ہے دیکھ لو۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔“
اسے میں ستر کے مالک سلطان صاحب بھئی انہ کر عمارے پاس آگئے
اور سیاست پر باتیں شروع ہو گئیں۔ سیاست نے مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں
تھی۔ اشفاق سیاست پر غور باتیں کرنے لگا۔ میں اس کی نظرس بچا کر تھوڑی
تھوڑی دیر بعد اوپر انٹیکسی کے برآمدے کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ مگر وہ کاسی
سوٹ والی لڑکی پھر نظر نہ آئی۔ ہم کافی دیر دستور ان میں بیٹھے رہے۔ پھر گرتی
برف میں ہی دستور ان کی بیڑیاں اتر کر سڑک پر آگئے اور واپس اپنے
کواٹروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

برہماری کے بیڑوں میں مری کی فیشن اسٹیل سڑکیں خالی خالی تھیں۔ مال
کی دکانیں بھی بند تھیں۔ مگر لوہے بازار میں دکانیں کھلی تھیں۔ یہ مقامی لوگوں
کی دکانیں تھیں۔ سارا دن وہاں مقامی لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے
ہوٹ کا ایک قہر لوٹ گیا تھا۔ میں قہر لینے لوہے بازار میں ایک خیامی کی دکان
پر کھڑا تھا کہ چپے سے دو عورتیں اوپر آتی نظر آئیں۔ ان کے لباس سے لگ
رہا تھا کہ وہ مقامی نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک خیامی بدن کی عورت تھی اور

ایک دل چاہی لڑکی تھی۔ لڑکی نے کاسی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ابھی وہ دور ہی تھیں
کہ میرے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔

میرے دل نے کہا۔ یہ کاسی سوٹ والی وہی ٹیرس والی لڑکی ہے۔ میں
تسے دیکھ لیتا بھول گیا۔ وہ میرا آوارہ گردوں اور آوارہ مزاجیوں کا زمانہ تھا۔
سڑک پر برف جمی ہوئی تھی۔ دونوں عورتیں بڑی احتیاط سے چڑھائی چڑھ رہی
تھیں۔ ہوا سرد تھی۔ برف نہیں گر رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب سے
گزرے انگلیں تو میں لڑکی کے قدم کاٹھ اور کاسی لباس سے اس نتیجے پر پہنچ کر
یہ وہی ٹیرس والی لڑکی ہے۔

دونوں کے لباس پھول رہے تھے اور وہ کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔
قریب سے گزرتے ہوئے اس لڑکی نے پونجی ایک ٹھکر بچہ پر ڈالی اور دونوں
عورتیں بھی ہوئی برف پر سنبھل سنبھل کر چڑھائی چڑھیں آگے نکل گئیں۔
میری نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہی ٹیرس والی لڑکی
ہے۔ اس نے سرخ ہاف کوٹ کی بجائے نل سلویوز اور بند گئے والا گمراہیو
سوٹر پہنا ہوا تھا۔

میں انہیں جاتا اور دیکھ رہا تھا۔ اوپر پہنچ کر جب وہ ڈاک خانے والے
چوک کی طرف مڑنے لگیں تو کاسی سوٹ والی لڑکی نے گردن موڑ کر میری
طرف دیکھا اور پھر دوسری عورت کے ساتھ تجزی سے آگے نکل گئی۔ میرے
دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ وہ نوجوانی کا دور تھا۔ وہ زمانہ ہی دل کی
دھڑکنوں کے شمار کا زمانہ ہوتا ہے۔ آخر عمر میں جا کر پھر آدمی کی دھڑکن
ایسا کچھ تیز ہو جائے تو وہ ڈر جاتا ہے اس کا رنگ اڑ جاتا ہے کہ کہیں مجھے
ہارٹ اٹک تو نہیں ہونے والا۔ جوانی میں دل دوسرے کے دل پر اٹک کر
بچے۔ آخری عمر میں خود اس پر اٹک ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جوانی کی
ساری فرمستیاں پھر آخری عمر میں آکر نکلتی ہیں۔ اسی لئے بیانے کہتے ہیں کہ
آوی جوانی میں اپنے آپ کو سنبھال کر رکھے تو آخری عمر بڑے آرام سے

مگر رتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آرام ہے کیا چیز؟ بعض لوگوں کو دل کے درد میں آرام ملتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ شاعرانہ بات ہے۔ محبت میں جو دل کا درد ہوتا ہے اس کا احساس تک نہیں ہو کہ اصل دل کا درد جو ہوتا ہے اس سے خدا بچائے۔ گرمی ماری محبت و تجوہ بھول جاتا ہے۔

مگر میری عمر ایسی باتیں سوچنے کی نہیں تھی۔ میں فوراً اس لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے خیالوں کی مجھ پر بھاری اور برا خوش ہوا کہ چلو میرا بڑبڑادی میں ایک روٹن بھی شروع ہو گیا۔ اس دماغ تک خیال نے ہی میرے وجود کو ایک آسمانی لذت اور روحانی سرور سے لہریز کر دیا۔ اب میں ایسے طریقے سوچنے لگا کہ اس لڑکی سے دوبارہ ملاقات کی جائے۔ میں نے اشتقاق سے اس کا ذکر نہ کیا۔ دوسرے روز ایسا اتفاق ہوا کہ اس لڑکی سے ایک بار پھر آگنا سامنا ہو گیا۔ کوہ مری کی میوہیل لائبریری بھی بڑبڑادی کے بیڑن میں اپنے اوقات کے مطابق کھلی رہتی تھی۔ میں لائبریری کی نیم گرم فضا میں بیٹھا ایک رسالہ دیکھ رہا تھا کہ وہی لڑکی لائبریری میں داخل ہوئی۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑی۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھی لائبریری کے پاس جا کر باتیں کرنے لگی۔ وہ کسی انگریزی فلمی رسالے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ لائبریری نے اسے الماری میں سے رسالہ نکال کر دیا۔ وہ رسالہ ہاتھ میں لئے واپس مڑی تو اس نے مجھے نیچے دیکھا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو دیکھنا ہی تھا۔ اس کے سوا وہاں دیکھنے کی اور چیز ہی کوئی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکی سی گئی۔ لکھ میری طرف جاتے جاتے رک گئی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔ کیونکہ ”ادب الہف“ اور ”موریا“ رسالوں میں میرے تنہا چار افسانے چھپ کر شہیل ہو چکے تھے اور ادب الہف میں میری ایک تصویر بھی چھپی تھی۔ وہ لڑکی رسالہ ہاتھ میں لئے میری طرف آئی۔ میں سنبھل کر

بٹھ گیا۔ آخر وہی بات نکلی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

”کیا آپ ابے حمید ہیں؟“ پھر وہ میرے ساتھ دلی کرسی پر بیٹھ گئی اور میرے افسانے ”منزل منزل“ کے متعلق باتیں پرچنے لگی۔

”کیا آپ کو واقعی ”منزل منزل“ کی ہیروئن راجدہ سے محبت تھی؟“

میں نے جھوٹ بولا۔

”نہیں اتنی محبت نہیں تھی۔ بس ساتھ ساتھ رہنے سے محبت ہو ہی

جاتی ہے۔“

میں اگر یہ جھوٹ نہ بولا تو پھر میرے لئے اسے یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی تھی کہ مجھے تم سے محبت ہے اور تم دنیا میں پہلی لڑکی ہو جس سے میں نے محبت کی ہے۔ کیا کروں؟ یہ جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ اصل میں دیکھا جائے تو یہ محبت و تجوہ بھی جھوٹ محبت کا کھیل ہوتا ہے۔ اس میں ایسا پردہ کرتا ہے کہ پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اس لڑکی کو یہ سن کر برا خود مدہ ہوا۔ میری طرف پلکیں جھپک جھپکا کر دیکھنے لگی۔ بولی۔

”تو آپ نے یہ سب کچھ جھوٹ لکھا تھا؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

کم از کم ایک ادیب کو جھوٹ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔

اس دوران میں نے اس کا اچھی طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ کچھ وقت کے لئے محبت کرنے کے واسطے وہ بڑی موزوں لڑکی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چار ملاقاتوں کے بعد اس سے اظہار محبت کروں گا۔

”آپ کو مری میں کہاں ٹھہرتے ہوئے ہیں؟“

میں نے اپنی جگہ بتائی تو وہ بولی۔

”میں اپنی آغی کے ساتھ کمپوٹل سینا کے پاس کالج کی انگیسی میں

ٹھہری ہوں۔“

میں نے اسے یہ بالکل نہ بتایا کہ میں وہاں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔

لڑکی ہوی اچھل چلیں بائپ کی تھی۔ بس یہی ایک مصیبت تھی۔ ایسی لڑکیاں عام طور پر بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ مگر یہ بات حوصلہ افزا تھی کہ وہ جھنگو بڑی و لغریب انہ ازمیں کرتی تھی اور اس کا تپلا ہونٹ بڑا خوبصورت تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی یونانی مجسمہ ساز نے یا قوت میں سے تراشا ہو۔ اس کا اصلی نام میں نہیں سمجھوں گا۔ آپ شرمیلا سمجھ لیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”کوہ مری کا اصل لطف پر غباری کے سینوں میں آتا ہے۔ جولائی اگست میں تو یہاں میلہ لگا ہوتا ہے۔ اس موسم میں مری اپنا حسن چھپا لیتی ہے۔“

وہ لڑکی بھی مجھ سے اپنا بہت ماحسن چھپا رہی تھی لیکن میں نے اس کے حسن کو بے غلاب کرنے کا ہفتہ عزم کر رکھا تھا میں کیا کرتا۔ وہ عمری ایسی تھی۔ وہ اردو افسانے پر باتیں کرنے لگی۔ معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی کے ایک کالج میں پڑھتی ہے اور اب وہ اس کا پسندیدہ سیکشن ہے۔ افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد کا ذکر بھی آیا۔ یہاں میں نے اپنے پاؤں پر آپ کھڑی مارے ہوئے اسے بتایا کہ اشفاق احمد بھی میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس پر وہ خوشی کے مارے کرسی پر اچھل سی پڑی۔

”کیا واقعی؟ اشفاق صاحب بھی مری میں ہیں؟“

اشفاق کے لئے اس کا اس قدر اشتیاق دیکھ کر میں جل پھن گیا۔ مگر اب میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ حیرت کان سے لگی چکا تھا۔ مجھے کہنا پڑا۔

”ہاں وہ میرے ساتھ ہی کوہ مری آیا ہے۔ شاید آج یا کل صبح وائس مائیں پر چلا جائے۔“

اب میں اشفاق احمد کو ہر قیمت پر راستے سے ہٹانا چاہتا تھا مگر وہ لڑکی یعنی شرمیلا تو اشفاق کی گرویدہ تھی۔ کہنے لگی۔

”ہمیں آپ کا احسان بھی نہ بھولوں گی پھر مجھے ایک بار اشفاق صاحب سے ملنا دیجئے۔ اشفاق احمد میرے پسندیدہ رائے نویس ہیں۔ بس

میں انہیں ایک بار صرف ایک بار اپنے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”یہ کوئی مشکل بات ہے۔ آپ آج شام یہ ساتھ والے سیر ریسٹوران میں آجائیں۔ میں اشفاق کو لے کر آجائوں گا۔“

لڑکی نے تپ ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”ابھی ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی؟“

میں دل میں اشفاق کو گالیاں دینے لگا۔ لڑکی سے کہا۔

”ابھی تو شاید وہ سو رہا ہو گا۔ چار بجے میں اسے لے آؤں گا۔“

”ہائے چار بجے تک میں کیسے انتظار کروں گی۔“

اب مجھے اس لڑکی پر بھی غصہ آنے لگا۔ میں نے دل میں اسے بھی گلی دی اور اوپر سے بڑی شائستگی سے کہا۔

”چار بجنے میں میں چار گھنٹے ہی باقی ہیں۔“

اب اس لڑکی نے اشفاق کی ان کہانیوں کی باتیں شروع کر دیں جو ”آدب لطیف“ میں حال ہی میں چھپی تھیں۔ مجھے اور فواد غصہ آ رہا تھا۔ اوپر سے میں مسکرا مسکرا کر ہوں پل کرنا جاتا تھا۔ پھر وہ چلی گئی۔ عمر جاتے جاتے مجھے بار بار یہی کہتی رہی۔

”پلیز! اشفاق صاحب کو ضرور لایئے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ وائس

مائیں پر چلے جائیں اور میں ان سے ملنے کی حسرت ہی لے کر یہاں سے جاؤں۔“

میں نے دل میں کہا۔ اب دفع بھی ہو جاؤ۔ مگر اوپر سے کہا۔

”فکرنہ کرو۔ اشفاق صاحب کو میں لے آؤں گا۔“

وہ چلی گئی اور میں نے دنیا میں مچھلی پکڑنے کے لئے جو کنڈی والی تھی اسے باہر نکال لیا۔ یہ مچھلی اشفاق کے کالنے میں پہلے ہی سے پھنسی ہوئی تھی اور میرا یہ اصول رہا ہے کہ میں دوسرے کا مارا ہوا شکار کبھی نہیں کھاتا۔

اشفاق کوڑا میں ہی تھا۔ میں نے برا سامنا نہ بنا کر کہا۔

"اوتے ایک فنسول ہی یہ شکل سی کوڑا مغز لڑکی تم سے ملنا چاہتی

ہے۔ چار بجے میرے ساتھ سمجھ رستوران میں چلنا۔"

میں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ یہ وہی میسر والی لڑکی ہے۔ اشفاق حسب

معمول لڑکی کے ذکر پر شرما گیا۔ میں نے اسے بھاڑتے ہوئے کہا۔

"لڑکیوں کی طرح شرمنا حق تو افسانے کیوں کہتے تھے؟ کس نے کنا تھا

افسانے لکھو؟ لڑکی تمہاری بڑی زبردست مداح ہے مگر بڑی بور

اور ٹھیکڑی قسم کی ہے۔ بس جس طرح تم بور ہونا لکھو کسی نے نہیں۔"

اشفاق شرمنا رہا۔ مسکراتا رہا اور بار بار کان کھاتا رہا۔ میں افسانے میں

فرش پر بڑی ہوئی چیزوں کو ٹھنڈا مارتا اپنے بستر پر جا کر ٹاف اوٹھ کر لیٹ گیا۔

اشفاق نے کہا۔

"تم سوئے گئے ہو۔ سمجھ نہیں جانا چار بجے۔"

میں نے ٹاف میں سے منہ نکال لیا اور اشفاق کی طرف دیکھا۔

"خواہ واہ! ابھی سے عشق کا بھرت سوار ہو گیا ہے۔ میں سو رہا ہوں۔"

چار بجے اٹھا دیتا۔"

چار بجے میں اشفاق کو لے کر سمجھ رستوران پہنچ گیا۔ آجکل اور آلود

تھا۔ ڈاک خانے کے چوک سے لے کر ایکشنی تک مال روڈ بالکل خالی تھی۔

ایک دھند سی اندر رہی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ بر فباری ہوگی۔ سڑی صحت زیادہ

تھی۔ ہوا بھی بڑی برقی چل رہی تھی۔ میں نے اشفاق کے قریب ہو کر کہا۔

"یہ لڑکی تمہاری زبردست مداح ہے۔ بلکہ تم سے بے حد محبت

کرتی ہے۔ تم زیادہ رکھو وہ اپنی زبان سے کبھی محبت کا اظہار نہیں

کرتی گی۔ یہ کام تمہیں کرنا پڑے گا۔ کرلو گے؟"

اشفاق نے مجھے بھاڑتے ہوئے کہا۔

"تم خواہ خواہ ہر بات پر ردائیں لگا کر محبت کا شوق کھدیتے ہو۔ کیا

محبت کے بغیر ہم کسی خانوں سے نہیں مل سکتے۔ وہ میری مداح ہے۔

تمہاری بھی مداح ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی پیئیں گے۔ باتیں

کریں گے۔ اچھا وقت گزاریں گے اور واپس آجائیں گے۔ کیا یہ

منووری ہے کہ اس کے سامنے میں اٹھتی ہوں کر محبت کے ذریعہ

بولنے شروع کر دوں۔ کیونکہ ابھی ردائیں کی جھٹک اٹا کر بھی لوگوں

کو دیکھ لیا کرو۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اگر اس موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تو نہ

سہی۔ میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ یہ ردائیں تمہارے افسانے کو

چار چاند لگا دے گی۔"

اشفاق احمد بولا۔

"میرے افسانے کو جو ایک دو چاند لگے ہوئے ہیں وہی کافی ہیں۔"

مال روڈ پر درمیان میں سے برف پڑا دی گئی تھی۔ اب صرف سڑک

کے کنارے برف کی ڈیریاں تھیں۔ ہم دونوں سڑک کے درمیان چل

رہے تھے۔ کینسل سینٹر کی پتھر کی دیوار کے اوپر چڑھ کر دوخت سرمئی بادلوں

میں گم ہو رہے تھے۔ یہ بادل برف لا رہے تھے۔ مال روڈ پر اندھیرا سا چھا

رہا۔ اشفاق خاموشی سے چل رہا تھا۔ ہم سمجھ رستوران میں آ کر بیٹھ گئے۔

اس وقت چار بج کر دس صحت ہوا تھی۔ سمجھ کا لمبا جھڑی کمرہ تقریباً خالی

تھا۔ کونے میں ایک گاہک اور کونٹ کے کنارے چھائے کھڑی کے قریب بیٹھا

شیشوں میں سے سڑک پر چھائے ہوئے سرمئی بادلوں کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ

سرمئی بادل دھوکے کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ درمیان میں غباری سنگ

رہی تھی مگر سڑی اس قدر زیادہ تھی کہ صرف غباری کے اوڑھ رہی گرماش

محسوس ہوتی تھی۔

میں نے کھڑکی کے دھندلے شیشے کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے اوپر

میرس کی طرف دیکھا وہاں بھی وحند آور ہادل چھا رہے تھے۔ مجھے اٹھکی تا
برآمد وغیرہ کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے میرے کو کہم کافی کا آرڈر دیتے ہوئے
اشفاق سے کہا۔

”میرا خیال ہے اس خراب موسم میں وہ لڑکی شاید گھر سے نہ
نکے۔“

اشفاق بولا۔

”ہو سکتا ہے نہ آئے۔ میں صرف اس کی خاطر نہیں آیا۔ میں تو
اس سرد ویران پر ٹپلے موسم میں کافی پیٹے آیا ہوں۔“

”اسی لئے میں نے کافی کا آرڈر دے دیا ہے۔“

دل سے میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ لڑکی نہ ہی آئے۔ مجھے اب اس لڑکی
سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں بھی کتنا خود غرض تھا۔ جب تک وہ
لڑکی میری دوستی کی باتیں کرتی رہی میں اس کے ساتھ رہا۔ اس کا دم بھرتا رہا۔
جو کسی اس نے کسی دوسرے لڑکے سے دلچسپی لینی شروع کی میں اسی کے خلاف
ہو گیا۔ شاید یہ انسان کی بلکہ مرد کی فطرت بھی ہے۔ شاید بچہ بھی یہی چاہتی
ہے۔ میں بار بار لڑکی کے شیشے کو صاف کر کے بیچے ہال پر لگا دیتا کہ وہ لڑکی تو
نہیں آ رہی۔ آخر وہ مجھے نظر آئی۔ اس نے گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ
دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دیکے اوپر ڈاک خانے کی طرف سے آ رہی
تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”لو بھائی! وہ آ رہی ہے۔ اچھا ہوا میرا ابھی تک کافی نہیں لایا۔“

اشفاق نے کروں موڑ کر پیچھے دیکھا۔ لڑکی سمجھ کا لہجہ چڑھ رہی تھی۔
میں اٹھ کر سینے کے پاس چلا گیا۔ لڑکی کا چہرہ مروی کی وجہ سے سرخ ہو رہا
تھا۔ میں نے کہا۔

”میرا خیال تھا موسم خراب ہو گیا ہے شاید آپ نہ آئیں۔“
وہ ہنس چڑی۔

”آپ روٹا ہوا افسانہ لگا رہو کہ اس موسم کو خراب کہہ رہے ہیں۔
یہ تو میری کا سب سے خوبصورت موسم ہے۔“
میں اسے لے کر اپنی میز کی طرف بڑھا۔ اس نے اشفاق احمد کے
بارے میں پوچھا۔

”اشفاق صاحب آئے ہیں نا؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں! وہ بیٹھے ہیں۔“

اشفاق احمد تعلیم کے طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے بے باکی کے ساتھ
اشفاق سے ہاتھ لگایا اور وہ اشفاق کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہر میرے
قرب سے گزرتا تو میں نے اسے اشارے سے کہا کہ تین کافی لائے۔ وہ اثبات
میں مسکراتے ہوئے سر ہلا کر آگے نکل گیا۔

اشفاق احمد نے لڑکی سے باتیں شروع کیں کیونکہ اس کے دل میں
لڑکی سے محبت وغیرہ کا کوئی خیال نہیں تھا اس لئے وہ پوری آزادی اور بے
تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اگر لڑکی اسے یہ کہہ دیتی کہ مجھے تم سے محبت ہے
میں تم پر دل و جان سے عاشق ہوں تو پھر معاملہ الٹ ہو جاتا۔

لڑکی اشفاق احمد کے افسانوں کے بارے میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ
لانا افسانے میں اس نے جو ناناں جملے لکھا ہے اس سے کیا مراد تھی۔ وغیرہ
وغیرہ۔ اس لڑکی کو اشفاق احمد کی کہانیوں کے جملے کے جملے یاد تھے۔ پھر لڑکی
نے اشفاق احمد سے میرے بارے میں پوچھا کہ اس کا میرے افسانوں کے
بارے میں کیا خیال ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں اور ٹیبل کالج کی اردو کی
کلاس میں بیٹھا ہوں وہ لڑکی مجھے بڑی خشک قسم کی دانشور لڑکی لگنے لگی تھی۔
پھر کافی رکھ کر چلا گیا۔

آجائیک مل روڈ پر سرمئی بالوں میں سفید سفید برف کی ہتھکڑیاں
گرنے لگیں۔ میں نے اشفاق احمد سے کہا۔

”برق کرنے لگی ہے۔“

اشفاق احمد اور لڑکی دونوں نے باتیں کرتے کرتے کھڑکی سے باہر دیکھا۔
باہر برف گر رہی تھی۔ میں نے کافی ہٹائی۔ کافی شاید اسی موسم کے لئے اسی
دن لگے لئے“ اسی برہنہ کے لئے قدرت نے ہٹائی تھی۔ سیاہ بادلوں کی وجہ
سے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سمندر پر ستوران کی جہازیں روشن ہو گئیں۔ لڑکی نے کہا۔
”میرا خیال ہے کھڑکی کھول دیں۔ کہتے ہیں برہنہ کے وقت جو

ہوا چلتی ہے وہ کچھ نہیں کہتی۔“

مگر اشفاق نے کھڑکی نہ کھولنے دی۔

”بی بی! اندر گرنا کس سے۔ باہر سردی ہے۔ کھڑکی کھول دی تو گرم
سرد ہو جائیں گے۔“

وہ موسم واقعی کھڑکی کھول کر بیٹھنے کا تھا۔ مگر اشفاق احمد کو ایسا پیشہ تھا کہ
کبھی اس کو زکام وغیرہ نہ ہو جائے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو رومان اشفاق
احمد کے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرا۔ میں کسی لڑکی نے رومان کی بات
نہیں کر رہا۔ بلکہ نیچر کے رومان کی بات کر رہا ہوں۔ رومان اس کے مزاج کے
خلاف ہے۔ چونکہ یہ اس کے مزاج کا حصہ نہیں ہے اس لئے میں بھی اس
کے ساتھ نیچر کے رومان کی باتیں نہیں کرتا۔ نیچر کے رومان کی دنیا ہی اور
ہے۔ یہ ملک ہی اور ہے۔ اس کی آب و ہوا ہی اور ہے۔ یہاں مجھے گوالیٹھی
کا ایک پہلوان یاد آگیا ہے۔ اس پہلوان کی گوالیٹھی میں دودھ کی وکان تھیں۔
حسن طارق نے مجھے بتایا کہ یہ پہلوان بیوی مزے دار باتیں کرتا ہے۔ اس کی
اپنی ڈبیشن ہے۔ ذرا تم اس سے کوئی بات کر کے دیکھو۔ میں نے حسن طارق
سے کہا۔ ”کیا بات کروں؟“

حسن طارق نے کہا۔

”پہلوان کو موسیقی کا بڑا شوق ہے۔ نہیں بھی موسیقی کا شوق

ہے۔ چلو موسیقی کے بارے میں اس سے کوئی سوال کرو۔“

آدم دونوں پہلوان کی وکان پر جئے۔ پہلوان دودھ کی بہت پتی کڑائی میں
کچھ نیچہ چلا رہا تھا۔ حسن طارق نے پہلوان سے کہا۔

”پہلوان بی بی! یہ میرے دوست ہیں۔ یہ آپ سے موسیقی کے

بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

پہلوان کا چہرہ بڑا بھولا بھالا اور معصوم تھا۔ کہنے لگے۔

”پوچھو بی بی! ضرور پوچھو۔“

میں نے پوچھی کہ دیا۔

”پہلوان بی بی! یہ جانتیں کہ راگ مالکونس اور راگ بھیروی میں کیا

فرق ہے؟“

پہلوان نے ہنس کر کہا۔

”یہ کیا بات کر رہی ہے آپ نے باؤ بی! کہاں راگ مالکونس کہاں

راگ بھیرویں۔ وہ ملک ہی اور ہے۔ آپ وہاں ہی اور ہے۔“

نیچر کے رومانس کے حوالے سے مجھ میں اور اشفاق احمد میں راگ

مالکونس اور راگ بھیرویں کا فرق ہے۔ وہ ملک ہی اور ہے اس کی آب و ہوا

ہی اور ہے۔ مگر ہمارا ایک گھر ضرور ملا ہوا ہے اور وہ ہے محبت کا گھر۔ اسی گھر

نے ہمیں ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے۔ چونکہ گھر طے ہوئے ہیں اس لئے

ہماری محبت بے غرض ہے۔ بغیر لالچ کے ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے ہمدرد

ہونا ہے نہ دینا ہے۔ چاہے دو سال بعد ملیں۔ دونوں چپ ملتے ہیں تو پھر محبت

کی ہوا چلنے لگتی ہے۔ پیار محبت کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور اسی پیار محبت کی

فضا میں ہم دوبارہ کئی سال بعد ملنے کے لئے جہاں ہو جاتے ہیں۔ برف زیادہ

گرے لگی تو وہ لڑکی جس کا فرضی نام میں نے خریشیلا بنایا تھا اٹھ کھڑی ہوگی۔

”اب میں جاتی ہوں۔ آئی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اچھا اشفاق

صاحب! پھر ملاقات ہوگی۔ آپ کل دونوں حضرات شام کی چائے

میرے ہاں کیوں نہیں پیٹے؟“ میری آئی بھی بڑی ادب دوست ہیں۔

وہ آپ دونوں سے مل کر بڑی خوش ہوں گی۔“
اشفاق کچھ ہنسا رہا تھا۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔
”ضرور آئیں گے۔ کتنے بچے آجائیں؟“
”یہی چار بچے آجائیں گے۔“

اشفاق ہوا۔

”موسم زیادہ خراب ہوا تو شاید ہم نہ آسکیں۔“
میں نے کہا۔

”کوئی خراب نہیں ہوتا موسم۔ خراب بھی ہوا تو ہم اسے ٹھیک کر لیں گے۔“

وہ چلی گئی۔ ہم ترقی برف میں اسے ڈاک خانے کی طرف چڑھائی پر
سنبھل سنبھل کر چلنے دیکھتے رہے۔ اشفاق کہنے لگا۔
”بڑی زبان خاتون ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کل شام اس کے ہاں چلو گے یا نہیں؟“

اشفاق شرما سا گیا۔

”یار! تم چلے جانا۔ میں کہاں جاؤں گا۔“

میرا خیال تھا کہ وہ دل سے نہیں کہہ رہا۔ مگر وہ دل سے کہہ رہا تھا۔
دو ہرے دن مجھے اکیلے ہی شرمیلا کے ہاں چائے پیر جانا پڑا۔ میں نے بڑا اصرار
کیا مگر اشفاق نہ مانا۔ یہی کتنا رہا۔

”یار! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میڈیو کے لوگ تو اختراع میکنڈل بنا دیں
گئے۔“

وہ ٹھیک کرتا تھا۔ اشفاق احمد کو ہمیشہ اپنی عزت نفس کا بڑا خیال رہتا ہے
اور یہی وہ بات ہے جس نے اتنے اس کی اولی حیثیت کے علاوہ معاشرے میں
ایک باعزت مقام عطا کیا ہے۔ اشفاق احمد کی دو سہری خویوں کے ساتھ ساتھ

میں اس کی اس خوبی پر بھی رشک کرتا ہوں۔ عزت نفس کا جو شخص بھی احترام
دے میں اس پر رشک کرتا ہوں اور اشفاق میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود
ہے۔ میرے دل میں اشفاق کے لئے جو محبت ہے اس میں اس کے اس وصف
بھی بڑا دخل ہے۔

میں اکیلا ہی شرمیلا کے ہاں چائے پیر چلا گیا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

”اشفاق صاحب نہیں آئے کیا؟“

میں نے کہا۔

”ابھی آجائیں گے۔ انہیں میڈیو کے لئے ایک ضروری تقریر لکھنی
پڑے گی ہے۔“

شرمیلا کے چہرے پر ایسی کاغذ سا چھا گیا۔ اس نے اپنی آنٹی سے
راہعارف کر لیا۔ شرمیلا نے چائے کا بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ
اہتمام زیادہ تر اشفاق احمد کی خاطر کیا گیا ہے۔ میں وہاں کچھ شرمندگی سی
سوس کر رہا تھا۔ شرمیلا کی آنٹی کو بھی اشفاق سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔
میں نے گئی۔

”اشفاق صاحب تقریر لکھنے کے بعد آجائے۔ ہم ان سے بڑی باتیں

کرنا چاہتے تھے۔“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”شاید آجائیں مگر میرا خیال ہے کہ انہیں دیر رات کے نو بج
جائیں گے۔“

اس شام برف بھی نہیں گر رہی تھی۔ کل کی گری ہوئی برف راستوں
جی ہوئی تھی۔ سردی بہت تھی۔ شرمیلا نے کمرے کے آئینہ ان میں آگ
رکھی تھی۔ کمرے کی فضا نیم گرم اور پرسکون تھی۔ میں نے سگریٹ سلکایا
شرمیلا کی آنٹی نے برا سامنہ بنایا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے سگریٹ کا دھواں

پسند نہیں ہے۔ میں نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور جان بوجھ کر سگرت کبکشل لگا کر آدھا دھواں اس کی طرف پھینک دیا۔ آٹلی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ شرمیلا موسم کی باتیں کرنے لگی۔ پھر اردو افسانے پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں مسلسل کوشش کر رہا تھا کہ میرے سگرت کا دھواں کچن کی طرف جائے جہاں شرمیلا کی آٹلی خدا جانے کیا کر رہی تھی۔ میں اس موٹی آٹلی کو زیادہ سے زیادہ سگرت کی دھوئی دیتا چاہتا تھا۔ خدا جانے میں کیوں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آٹلی کچن میں سے نکل کر وہ رے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس وقت میں سگرت نہیں پی رہا تھا۔ میں آٹلی کو دھوئی دینے کے لئے سگرت سگانے لگا تو شرمیلا نے کہا۔

”آپ اتنے سگرت نہ پیا کریں۔“

میں نے شرمیلا کا خیال کر کے سگرت ڈالیں پیکٹ میں رکھ دیا۔

”میں زیادہ نہیں پیتا۔ بس ابھی کبھی خواہ مخواہ سگرت سگانے کو دل

کرتا ہے۔“

اس وقت میں شرمیلا کی موٹی آٹلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے

دیکھ رہا تھا۔ یہ آنکھوں سے دیکھنا بھی عجیب ہے۔ میرا خیال ہے اس کا مطلب

کان اور آنکھوں کے درمیان میں سے کسی کو دیکھنا ہوتا ہے۔



شرمیلا کے ہاں سے میں کافی دیر بعد واپس آیا۔

رات کا اندھیرا مری میں پھیل چکا تھا۔ بال روڑ کی بنیاں سرو کھڑے میں

بھللا رہی تھیں۔ ان کی روشنی کھجور تک ہی محدود تھی۔ ساری سڑک

دیران تھی۔ سمجھ بھی بند ہو چکا تھا۔ میں برف کے درمیان بہتے ہوئے راستے پر

آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتا اور ریڈیو پیشانی کی طرف سے دیئے ہوئے کواٹروں

میں غلیا۔ اشتقاق احمد جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”ایڈیو دیر لگا دی۔ اتنی دیر کہاں کیا کرتے رہے؟“

میں نے اور رکوٹ اتار دئے ہوئے کہا۔

”کیا کرنا تھا؟ شرمیلا تمہاری تعریفیں کرتی رہی۔ میں سنتا رہا۔“

”پھری طرف سے معذرت کر دینی تھی نا؟“

”کر دی تھی۔“ میں نے ہنسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”ویسے تم چلے

جاتے تو ان لوگوں کو بڑی خوشی ہوتی۔ انہوں نے چائے کا بڑا اہتمام

کر رکھا تھا۔“

”بس پار۔“ اتنا کہہ کر اشتقاق چپ ہو گیا۔

اس کے بعد ہم ایک بسیڈ کو مری میں رہے۔ اس دوران دو تین بار

شرمیلا نے ہماری ملاقات ہوئی۔ ایک بار ماں روڈ پر آتے جاتے۔ وہ سری بار

میں لپٹ لائبریری میں اور تیسری بار سمجھ رہے تھوڑے دن میں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ

تینوں بار اشتقاق میرے ساتھ نہیں تھا اور شرمیلا اشتقاق احمد کو یاد کرتی رہی۔

ہم لوگ کوہ مری کو الوداع کہہ کر واپس لاہور آ گئے۔

لاہور میں ہم دونوں کی نئی بھرپور ادبی زندگی کا دور شروع ہو گیا۔ اس کے بعد کوہ مری والی شرمیلا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شروع شروع میں ہم باتوں باتوں میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر وہ ہمارے ذہنوں سے بھی اتر گئی۔

یہ سات برس پہلے کی بات ہے کہ میں ٹیلی ویژن سٹیشن سے نکل رہا تھا کہ ایک ٹیکسی گیٹ کے پاس آکر رکی۔ اس میں ایک خلیلی بیٹی تھی۔ بیٹی تھی۔ وہ عورتیں تھیں۔ ادیٹر عمر کی ایک موٹی عورت باہر نکل کر ٹیکسی والے کو پرس میں سے پیسے نکال کر دینے لگی۔ دوسری عورت جوان تھی وہ بچوں کو باہر نکالنے لگی۔ ادیٹر عمر کی موٹی عورت کو دیکھتے ہی مجھے خیال گزرا کہ اس عورت کو میں بنے پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔ اس وقت وہ عورت پلٹ کرٹی دی کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ بھی ٹھٹھک گئی۔

اب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ یہ دی 1948ء کے کوہ مری والی افسانہ نگار تھیں۔ اس کی اسٹینڈنگ بوڈمی اور موٹی ہونگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر شرمسار ہو رہے تھے کہ ہم کیوں مل گئے۔ میں نہیں ماننا چاہیے تھا۔ ملنے کی عمر تو وہی تھی جب ہم کوہ مری میں ملے تھے۔ جب اس وقت مل کر ہم وقت کے ہاتھ سے پھسل کر گر پڑے تو اب ملنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر نے اس کے تجربے پر سے ذہانت اور روانوی افسردگی کی تمام روشنیاں گل کردی تھیں۔ اس کے جسم کی وہ تمام دلی ہلکی پگ ڈیڑیاں جو کوہ مری کے برف پوش درختوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھیں، بوجھاپے اور موٹاپے کے بالوں میں عیش عیش کے نئے غائب ہو چکی تھیں۔ اس کے سر کے بالوں پر بھی میرے بالوں کی طرح وقت کی برف گر رہی تھی۔ کوہ مری میں جب ہمارے بالوں پر برف گرتی تھی تو ہم اسے جھٹک کر جھاڑ دیا کرتے تھے۔ مگر اب جو برف گر رہی تھی وہ ہمارے بالوں کو مفید کرنے کے لئے گر رہی تھی۔

اس نے دوسری عورت سے میرا تعارف کرایا۔ یہ میری بیٹی ہے۔ یہ

اس نے کہہ دیے ہیں۔ اس عورت نے ایک سرسری سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر بچوں کو ٹیکسی میں سے باہر کھینچنے لگی۔ میں نے شرمیلا سے اشفاق کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا۔

”اشفاق احمد سے ملاقات نہیں ہوئی؟“ اس نے سپاٹ پھرے کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جیسے وقت کے ٹکڑے کرکٹ میں سے سوئی حواش کر رہی ہو۔

”ہاں! اشفاق صاحب سے نہیں۔ ان سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔

ہم لوگ دہلی میں ہوتے ہیں۔ وہاں میرے میاں کا اپنا کاروبار ہے۔“

ایک لڑکا گیٹ کی طرف وڑا تو شرمیلا نے اپنی بیٹی کو چنگ کر لیا۔

”نی سٹراں اسے پکڑ۔“

میں نے شرمیلا سے اس ملاقات کا ذکر اشفاق احمد سے کیا تو وہ بیجا حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

”کون شرمیلا؟“

جب میں نے کوہ مری کے زمانے کا ذکر کیا تو وہ ہنس پڑا۔

”اچھا؟ یاد وہ کسی تھی؟“

میں نے کہا۔

”بس ویسی ہی تھی جیسے ہم ہو گئے ہیں۔“

”ہاں یاد! بڑا وقت گزر گیا ہے اس بات کو۔“

وقت رست گزر گیا تھا۔ وقت اب بھی گزر رہا ہے۔ پہلے اس کے گزرنے کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اب وہ جسم کے ہر حصے پر سے گزرتا نظر آتا ہے۔ کبھی وہ نقش و نگار بناتا تھا۔ اب وہ نقش و نگار بگڑ رہا ہے۔ اس نادان بچے کی طرح جو اپنی ہی بنائی ہوئی تصویر پر بکیریں مار رہا ہو۔ اگر کسی شے پر

وقت کا اثر نہیں ہوتا تو وہ محبت ہے۔ محبت کا جذبہ ہے۔ محبت کے ساتھ چلتے

ساتھ جھوٹا دیا ہے جو آدمی پر وقت کا اثر نہیں ہونے دیتیں۔ اسی مدت گزر جانے کے بعد، اتنا سفر طے کر لینے کے بعد، صحرائوں، پہاڑوں، دلوں سے گزر کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد نیچے اٹھو ڈالنا ہوں تو مجھے اشتقاق احمد کے ساتھ ایک بھی خوشبو ایک بھی پری دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا ان چیزوں کے ساتھ بھی کوئی ربط نہیں رہا۔ یہ چیزیں اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہیں۔ یہ رات کی رانی کا بھی حوصلہ ہے کہ وہ سارا دن خوشبو کے سیلاب کو اپنے سینے میں دبائے رکھتی ہے۔ کیا حال ہے کہ رات ہونے سے پہلے خوشبو کی بگلی سی مہک بھی اس کے سینے سے باہر نکل آئے۔ یہ مہر، یہ شعل، یہ برواشت رات کی رانی کو نیچر نے سکھائی ہے جس کی خوشبو نہیں منٹھی منٹھی چہاں رہا کر اس کے آنکھن میں نازل ہوتی ہیں۔

برسات کا موسم تھا۔ میں اشفاق احمد کے پاس اس کے اردو مرکز والے دفتر میں بیٹھا تھا۔ مشرق کی جانب سے کالی گھٹا اٹھی اور ان کے وقت اندھیرا سا چھا گیا۔ کمرے میں اسے سی لگا تھا۔ شیشے کی ریگ والی دیوار بند تھی۔ شیشے میں سے باہر درختوں کی شاخیں ہوا میں جھومنی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

وہ اپنے سی والہ کمرو میں چھوٹا چاہتا تھا۔ مگر میرے ساتھ باہر برآمدے میں گیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بارش شروع ہو گئی۔ پہلے ہلکی ہلکی پھر تیز ہو گئی۔ بارش کی لہ چھاڑیں برآمدے میں ہمارے اوپر آنے لگیں۔ ان ہواؤں میں بارش کی خوشبو میں تھیں۔ سارے درختوں سارے پودوں سارے سرسبز گھاس کی خوشبو میں تھیں۔ نہ جانے کیسے اوز کیوں مجھے بارش کی گیلی ہوا میں مسند کی خوشبو کی لہری مسندس ہوا کی لہر مجھے لڑکھن میں سنا ہوا ایک گیت یاد آیا۔

کے کا نزل پانی

تیرا جیون ایک کہانی

ان دنوں مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ لگا کیا ہے۔ ریل پانی کیا ہوتا ہے۔ جیون کیا ہے اور کہانی کیا ہوتی ہے۔ بس سامنے ایک سمندر تھا۔ پیچھے تاریل اور کیلے کے درخت تھے۔ رنگوں کے بارش میں جھلکتے بازار تھے۔ میلی سڑک پر چمکی دکانوں کی دھندلیاں تھیں اور فضا میں پھیلی ہوئی چائے کافی، سگار اور سمندر کی خوشبو نہیں تھیں۔ بارش کی ہوجھاڑیں زیادہ تیز ہو گئیں تو اشفاق نے کہا۔

”چلو اندر چل کر بیٹھے ہیں۔“

لاہور کے قائد دست شاعروں ادیبوں کے ساتھ اشفاق احمد کا باقاعدہ انٹنا میٹھا بھی بھی نہیں تھا۔ ایسا کوئی شاعر ادیب راستے میں مل جاتا تو اشفاق اس کے ساتھ انٹائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا اور بعد میں مجھے کہتا کہ یاد ان لوگوں کی زندگی پر مجھے رشک آتا ہے۔ اپنے جال میں مست رہتے ہیں لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اشفاق احمد کو اس قسم کے شاعر ادیبوں پر بھی رشک نہیں آتا۔ قائد مست اور مفید خوش محنت سخن شاعروں ادیبوں سے اشفاق احمد پاک ٹی ہاؤس کے زمانے میں ہی الگ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ ان لوگوں کو صرف ٹی ہاؤس میں ملتا۔ اس نے شروع ہی سے اپنے لئے دور راستہ چنا تھا۔ وہ کبھی استیوں سے ہوتا ہوا قعر سلطانی کی طرف جاتا تھا۔ وہ قعر سلطانی پر تو اپنا شہین نہ بنا سکا کہ وہاں سے واپس بھی نہ آیا۔ وہ انسر ٹائپ کے سرکاری ادیبوں میں بیٹھ کر بڑا خوش ہوتا ہے۔ اس قسم کے ادیبوں اور شاعروں میں بیٹھ کر جب میں اسے سیاست اور سیاسی جوڑ توڑ کے بارے میں بدی گر بخوشی سے باتیں کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی افسانہ نگار ہے جس نے ”سمان ہلر“ اور ”گنڈر میا“ جیسے افسانے لکھے تھے۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ کچڑ کر اسے باہر درختوں کے پاس لے جاؤں۔ اگر باہر درخت نہ ہوں تو نہ سہی کم از کم کھلا آسمان تو ہو گا۔

آہٹوں پر پرواز کرتا ایک آدھ پر مدہ تو ہو گا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ہم دونوں اپنے ایک دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر شیخوپورے والی سرپر گئے تھے اور اشفاق احمد نے شلوار قمیض سمیت سر میں پھلا گلاب لگا دی تھی۔ یہ کام میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت مجھے وہ بڑا اچھا لگا تھا۔ سر میں تھرتے ہوئے اس کی شلوار مشک کی طرح پھول کٹی تھی۔ مجھے بدی بدی آتی تھی۔

اشفاق احمد غور کیا ہے؟ اس کے متعلق اس کی بیگم ہاتھ قدمیہ ہی بہتر جانتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اچھا غور ہو گا۔ اس کی ایک اور بات مجھے بہت پسند ہے کہ وہ اپنے گھریلو معاملات اپنے تک ہی محدود رکھتا ہے۔ مجھ سے کبھی اپنے بچوں کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ یقین کریں مجھے اس کے بیٹوں کے نام تک معلوم نہیں ہیں اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کون کہاں ملازم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں بھی اپنے دوستوں کے گھریلو معاملات میں کبھی دخل اندازی نہیں کرتا۔ دوستوں کی اولاد سے مجھے پیار ضرور ہوتا ہے مگر میں نے کبھی کرید کرید کر نہیں پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو۔ یہ کیوں نہیں کرتے۔ وہ کیوں نہیں کر لیتے۔ کیونکہ میں اتنا جانتا ہوں کہ جس کسی نے جو کرنا ہوتا ہے وہ وہی کرتا ہے بلکہ کر کے رہتا ہے۔ جن لوگوں نے دوسروں کی نصیحتوں اور مشوروں پر عمل کیا میں نے انہیں آخر میں بچھڑاتے ہی دیکھا ہے۔

اشفاق احمد کا ونڈ رائٹنگ بہت اچھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ ریڈیو وینچرو کے سکریٹ عام طور پر کانڈ کی ٹیلی کٹ کر این پر لکھتا ہے اور کالی روٹھائی والا اڈی جین استعمال کرتا ہے۔ کانڈ پر لکھے ہوئے اس کے الفاظ بڑے میدھے اور پکوانتے ہوتے اور جیسے ہوتے ہوتے ہیں۔ اس کا تجزیہ تو کوئی ونڈ رائٹنگ کا ماہر ہی کر سکتا ہے۔ مجھ اس کی لکھائی بڑی اچھی لگتی ہے۔ جب کبھی اس کا کوئی خط یا نسی رہتے پر لکھا ہوا کوئی پیغام مجھے ملتا ہے تو میں اس کی لکھائی دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہوں۔ اردو زبان کے قواعد پر اسے کافی

مہور حاصل ہے اور بڑے بر محل الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اپنا مہسوم ادا کرنے کے واسطے وہ لفظ دھونڈ کر لاتا ہے۔ مجھے اس سے اختلاف بھی ہے اور اختلاف یہ ہے کہ وہ دلی لکھنؤ والوں کی زبان لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ دلی لکھنؤ کی زبان کے مٹاورے استعمال کرتا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ وہ بعض چیزوں کے نام پنجابی میں عام ملتے ہیں دلی لکھنؤ میں بولے جانے والے نام لکھتا ہے۔ اکثر اوقات اسی کے جملوں کی نقل بھی اہل زبان کی نقل میں ہوتی ہے۔ میں اسے ان نچلے یا ب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ہم پنجاب میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں دی اردو لکھنؤ چاہیے جو ہم پر پنجابی زبان کے سانچے میں داخل کروا رہی ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی زبان کے بارے میں میں کچھ نہیں کہتا۔ دلی کی زبان کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ دلی والوں کی اردو لکھنے کے لئے دلی شہر میں کم از کم سات سو برس تک قیام کرنا ضروری ہے۔

اشفاق احمد سے اب کسی قریب پر ہی ملاقات ہوتی ہے اور ان میں شرط یہ ہے کہ قریب بھی کوئی دور مرا کرے۔ میں خود اپنے کام میں مصروف ہوتا ہوں۔ اس کے باوجود میں دو چار مہینوں میں اس سے ملاقات کرنے کا کوئی نہ کوئی وقت نکال لیتا ہوں اور کسی دوست کی گاڑی میں میں اس سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہم ڈرائنگ روم کھلو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے آجاتی ہے۔ میں بڑے اہتمام سے خود چائے بناتا ہوں۔ شروع شروع میں اس کے ہاں چائے اچھی نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب اس نے بڑی عمدہ چائے منگوا رکھی ہے۔ ہم چائے پیتے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے خاص انداز میں بڑی مزیدار باتیں سناتا ہے۔ یہ باتیں نہ علمی ہوتی ہیں نہ ادبی ہوتی ہیں۔ نہ سیاسی ہوتی ہیں نہ معاشی اور نفسیاتی ہوتی ہیں۔ جس کچھ پرانے دنوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کچھ نئے زمانے کی باتیں کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک بار میں اشفاق کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ ہم

چائے بھی پی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے کہ ہم نے سب چائیکوں نہ ایک دن باہر نکل کر اپنی پرانی یادگاروں کی سیر کی جائے۔ اشفاق احمد نے کہا۔

”اگلے ہفتے کوئی دن رکھ لو۔“

ہم نے ایک دن طے کر لیا۔ اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سڑیوں کی کد گد تھیں۔ دھوپ میں وہ شدت نہیں رہی تھی۔ اشفاق احمد میرے گھر آگیا۔ میں پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اشفاق نے پوچھا۔

”نیا خیال ہے پہلے کس طرف چلا جائے۔؟“

میں نے کہا۔

”میں آباد میں ہیں تو پہلے کیوں نہ تمہارا مہمن آباد والا مکان دیکھا

جائے۔ اگرچہ اب اس کی جگہ ایک دو منزلہ کوٹھی بن چکی ہے مگر

وہ جگہ تو وہی ہے۔“

”ہاں بارہا پہلے وہیں چلتے ہیں۔“

اشفاق احمد کا مہمن آباد والا مکان میرے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے گاڑی سکول کی دیوار والی سڑک پر ڈال دی۔ سکول سے آگے بائیں جانب مہمن آباد کی مسجد حضرت والی گراؤنڈ آگئی۔ اشفاق بڑے غور سے دائیں جانب کے ٹانگی کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہتے لگا۔

”یہیں کہیں ہمارا گھر تھا۔“

میں نے کہا۔ ”گاڑی اسی طرف کھڑی کرلو۔“

اس نے گاڑی بائیں طرف درختوں کے نیچے کھڑی کر دی۔ میں نے سامنے والی دو منزلہ کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں ہوتا تھا تمہارا مکان۔“

اشفاق احمد بڑی دلچسپی سے کھڑکی کا شیشہ اتار کر سامنے والی دو منزلہ کوٹھی کو دیکھتے لگا۔

”یہ جگہ کتنی بدل چکی ہے۔“

پھر اس نے گراؤنڈ کی طرف لگاؤ ڈالی اور کہا۔
 ”میں کل کھجور کے تین درخت ساتھ ساتھ آگے ہوئے تھے۔“
 ”ہاں جنہیں میں تھری سسڑا کر رہا تھا۔“

اب ان درختوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں تھا۔ اس زمانے میں گراؤنڈ میں خاک اڑا کرتی تھی۔ ساری گراؤنڈ میں کھجور کے صرف تین درخت تھے جو ساتھ ساتھ آگے ہوئے تھے۔ باقی ساری گراؤنڈ کھردر رہی تھی۔ اب وہاں سرسبز گھاس تھی۔ پھولدار پودے لہرا رہے تھے۔ شمل اور پاپو لہر کے درختوں کے جھنڈے سایہ کئے ہوئے تھے۔

ہم گاڑی سے نکل آئے اور سڑک کے کنارے وہاں آکر کھڑے ہو گئے، جہاں سبز عیاں نیچے باغ میں اترتی تھیں۔ اس نے کہا۔

”یہاں ایک آدمی بیٹا سائیکل مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس نے سائیکل کے ٹائیر درخت پر لٹکائے ہوئے تھے۔“

میں نے کہا۔
 ”جنت ہوئی وہاں سے غائب ہو چکا ہے۔ کیونکہ تمہارے یہاں سے جانے کے بعد میں سمن آوازیں آگیا تھا۔“

ہم گراؤنڈ والے باغ میں تھوڑی دیر تک روٹوں پر پھرتے رہے۔ شمل کے درخت بڑے گھٹے تھے۔ میں نے کہا۔

”یہ ابھی بچے ہیں۔ میرے سامنے چھوٹے چھوٹے تھے۔ یہ درخت کچھ نہیں تو پانچ چھ سو سال تک ہوتا ہے۔“

میں نے شمل کے درخت کے غصے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 ”یہ میرا یاد ہے۔ میں صبح میر کرنے یہاں آتا ہوں تو یہ میرے

دانتوں میں جاگ رہا ہوتا ہے۔ درخت کبھی نہیں سوتے۔ اگر سوتے بھی ہیں تو سوائے درختوں کے اور کسی کو چہ نہیں چماتا۔“

کیڑیوں میں گلاب کے رنگ پرنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ ساتھ دلی

گراؤنڈ میں لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اشفاق نے گھراسائیں بھرا اور بولا۔
 ”وقت کتنی تیزی سے گزر گیا ہے۔“

ہم گاڑی میں بیٹھ کر سمن آواز سے باہر نکل آئے۔ اشفاق نے پوچھا۔
 ”اب کس یادگار کی طرف چلیں؟“
 میں نے کہا۔

”یہاں سے مجھ کو شمل پہاڑی کی طرف ڈال دے۔ پرانے ریڈیو سٹیشن والی جگہ کو بیل کر دیکھتے ہیں۔“
 ”اوتے کم بخت! کیا یاد کرا دیا۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔ گریڈا! وہاں تو اب کچھ بھی نہیں ہو گا۔“

”جو بھی کچھ ہو گا بیل کر دیکھتے ہیں۔“

”ہماری مجھ کو درخت باؤس کے پیچھے سے ہو کر شمل پہاڑی سے بان روڈ کی طرف جاتی سڑک پر آئی تو اشفاق نے کہا۔

”میر سڑک تو پہچانی نہیں جاتی۔ تمہیں یاد ہے یہاں دونوں جانب کی لائنوں کے چھوٹے ٹٹ پائڈ ہوا کرتے تھے جن کے اوپر سرخ

پھولوں والے درخت سایہ کئے ہوئے تھے۔“

میں نے کہا۔

”مجھے سب یاد ہے۔ ہم نے وہ درخت قتل کر دیئے ہیں اور اب خود قتل ہو رہے ہیں۔“

ہم پرانے ریڈیو سٹیشن والی سڑک پر آکر ایک کوٹھی کے سامنے رک گئے۔ میں نے کہا۔

”یہاں ابھی ریڈیو سٹیشن ہوا کرتا تھا۔“

ہم دونوں اس وقت، مٹی کی خواہصورت گھراؤ اس یادوں میں کھو گئے۔
 ”کیسے کیسے فنکار آرمسٹ یاد نہیں آئے۔ محمد حسین یاد کیا۔ آفتاب احمد، عقیل،

مہدی حمید، شام احمد، نسیم، سلیم شہاب، اخلاق احمد، دہلوی، سب یاد آئے۔ ایوب

رومانی یاد آئے۔ اسی کی یاد کے ساتھ کئی ایک رومان یاد آئے۔ ہائیں جانب ایک چھوٹا سا گھوٹا سر سبز پلاٹ ہوا کرتا تھا جس کے کنارے کھارے جاسن کے اونچے اونچے درخت اُگے تھے۔ برسات کے موسم میں یہاں ٹھیکیدار کے آدمی جنگی ڈال کر بیٹھ جاتے تھے۔ بڑی بڑی ہائیں کی سیڑھیاں لگ جاتی تھیں اور درختوں پر سے جاسن اتارے جاتے تھے۔ اب وہاں صرف دو درخت دونوں جانب شور پکاتی سڑک کے درمیان حیران پریشان کھڑے تھے۔ پرانے ریڈیو سٹیشن کی عمارت کی جگہ اب ایک نئی کوٹھی بن چکی تھی۔

اشفاق نے مجھے وہ ملی یاد دلائی جو ریڈیو کی کینٹین میں بیٹھی رہتی تھی۔ کینٹین کا لڑکا چائے کا ٹرے لے کر جس کمرے میں جاتا ملی اس کے ساتھ ساتھ جاتی۔ وہاں ایک بیچ میں دو درخت ڈال کر دیا جاتا جسے وہ بڑے شوق سے چتی۔ ایک توبہ شکن انگوٹھی لیتی اور واپس کینٹین کے کونے میں آکر بیٹھ جاتی۔ مجھے دوسرے نامور موسیقاروں اور گلوکاروں کے ساتھ استاد برکت علی خان بھی یاد آئے جو بوسکی کا کھلا کر "کھل کا لاچہ باندھے تلنگے میں سے بڑی درویشانہ سی نیازی سے اترتے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے چاندی کی انگوٹھیاں چمک رہی ہوتیں۔ پھر ہم دونوں کو کالے ظن صاحب یاد آگئے۔ جو اپنی جوانی کے زمانے میں دن کے وقت دریائے راوی پر ریاض کرنے جایا کرتے تھے۔ پرانے ریڈیو سٹیشن کے زمانے میں وہ کافی عمر ہو گئے تھے۔ ہم دیر تک گاڑی میں بیٹھے ریڈیو سٹیشن کی پرانی یادوں کو زندہ کرتے رہے۔ اشفاق کہنے لگا۔

"تمہیں یاد ہے۔ یہاں سے ہی پہلی مرتبہ میں نے اپنا ریڈیو منیجر "ستیش شاہ" شروع کیا تھا۔"

وہاں سے اگل کر ہم پہلی ڈیزن سٹیشن والی سڑک یعنی انہٹ روڈ پر آگئے۔ یہاں گاڑیوں کا اس قدر رش تھا کہ گزرتا محال ہو رہا تھا۔ میں نے اشفاق کو وہ دن یاد کرایا جب میں قلعہ گجر سنگھ والی سڑک سے نکل کر انہٹ

روڈ کی ٹاہلیوں کے نیچے سے گزرتا پرانے ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا تھا اور نیچے سے اشفاق احمد سائیکل پر آ رہا تھا اور وہ میرے قریب آکر سائیکل سے اتر گیا اور پھر ہم بائیں کرتے پیدل چل پڑے تھے۔ اشفاق احمد گاڑی بڑی آہستہ چلا رہا تھا۔ اس کی نظریں سائے سڑک کے ٹرفٹ پر تھیں تھیں۔ کہنے لگا۔

"یار! اس زمانے میں یہ سڑک کس قدر خاموش خاموش ہوا کرتی تھی۔"

اس زمانے میں سڑک کی دونوں جانب گھنٹان ٹاہلیوں کے درخت ہوتے تھے۔ ہوا ان دونوں میں سے گزرتی تو پتوں کے سرسراہٹ کی آواز کیا کرتی تھی۔ ہمارے زمانے میں ٹاہلیوں پر بور آتا تو سارا راستہ ان کی خوشبو سے منک جاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ٹانگہ یا سائیکل سڑک پر سے گزرتا تھا۔ ہماری گاڑی کبھی چوک کی ٹرفٹ لائنس پر آکر رک گئی تھی۔ میں نے ہائیں جانب دالی پلٹنگ کی بالکونی پر نگاہ ڈالی تو اشفاق فوراً سمجھ گیا کہ مجھے کیا یاد آیا ہے۔ کہنے لگا۔

"تمہیں ضرور غفور بیٹ یاد آگیا ہو گا۔"

غفور بیٹ بہت روز "مکرمین لائٹ" کا مالک اور ایڈیٹر تھا۔ دوسری منزل پر اس کا دفتر تھا جہاں ہم شاعر ادیب تقریباً روزانہ شام کو مل بیٹھتے تھے۔ ہم سب قاعدہ مست ادیب تھے۔ اشفاق احمد کبھی کبھی وہ بھی میرے امرا پر یہاں آجاتا۔ اشفاق احمد نے کہا۔

"وہ کیا چو کھتا تھا جو غفور بیٹ نے اپنے اخبار میں لگایا تھا؟ ذرا وہ بتاؤ۔"

بات یہ ہوئی تھی کہ مبارک سیما کے مالک ملک مبارک صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غفور بیٹ سیڑھیاں چڑھ کر ہانچا ہوا آیا اور اپنے ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جیل! ملک مبارک کی وفات پر معذرت کاچ کھٹا لگانا نہ بھولنا۔“

جیل نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”معذرت کاچ کھٹا؟“

فلور ہٹ بولا۔

”ہاں ہاں وہی کہ ملک مبارک کے انتقال پر اراکہ مکرین لائیں ان

کے لواحقین سے معذرت خواہ ہے۔“

فقوریت کو یاد کرتے ہوئے ہم نسبت روز کی طرف مڑ گئے۔ اب ہم

”لیل و شمار“ یعنی ”پاکستان ٹائمز“ والی بلڈنگ کی طرف جا رہے تھے۔ کبھی

اس بلڈنگ میں روزنامہ ”امید“ روزنامہ ”پاکستان ٹائمز“ اور ”وقت روز“

لیل و شمار کے دفاتر ہوا کرتے تھے۔ یہاں بڑی مجلس لگا کرتی تھیں۔ پہلے

امروز کے مولانا چراغ حسن حسرت ایڈیٹر تھے۔ پھر احمد ندیم قاسمی آگئے تو

ادیبوں اور شاعروں کا رخ اس طرف ہو گیا۔ ”لیل و شمار“ کی ادارت اشفاق

احمد کے پاس آئی تو اس کے دفتر میں بھی صبح شام ادیبوں کی رونق رہنے لگی۔

میں تقریباً روز ”لیل و شمار“ کے دفتر میں آتا تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اشفاق کے

سجے سجائے کمرے میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا اور اس کے بعد پاک ٹی

پاؤس کی طرف چل دیتا۔

سڑک پر گرد اڑ رہی تھی۔ گاڑیوں کا بے پناہ رخ تھا۔ ہماری دائیں

جانب پاکستان ٹائمز کی عمارت آگئی۔ یہ وہ عمارت نہیں تھی۔ اس عمارت کے

کھڑو کا کھڑا تھا۔ باہر سے ہی چھتیں بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بہن پائش

کی ہوئی فراخ میزھیوں پر سے ہو کر ہم لوہ پر جایا کرتے تھے ان میزھیوں پر

خاک اڑ رہی تھی۔ میز عیاں نوٹ بھرت چکی تھیں۔ ساری کی ساری بلڈنگ

عبرت کا افسوس پیش کر رہی تھی۔ جہاں سڑک کی جانب ”لیل و شمار“ کے دفتر

ہوا کرتے تھے۔ وہاں برآمدے کی کھڑکیاں بوند ہو کر بیچے کو جھک آئی تھیں۔

پھٹ کے ٹوٹے ہوئے پرنا لے سے گرتے بارش کے پانی نے سادھی دیوار کو

داغ دار کر رکھا تھا۔ پرنا لے کے اوپر پچیل کی ٹٹیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔

”یہ تو عبرت کا مقام ہے۔“

اشفاق نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے تو یہ عبارت پچالی نہیں جاتی۔“

”تم بڑی مدت کے بعد اوھر آئے ہو۔ اسی لئے میں نہیں کہہ کر

ہوں کہ ان جگہوں پر آتے جاتے رہا کہیں۔“

میں نے کہا۔

”پلو اب تمہارا ”راستان کو“ کا دفتر دیکھتے ہیں۔“

اشفاق کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ تھوڑی دیر کے لئے

نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔

”وہاں بھی اب کیا رکھا ہے۔“

ہم ٹیکسٹ آفس کی بٹلی سڑک سے نکل کر بڑے ڈاک خانے کے

سامنے آگئے۔ وہاں اتنا رخ تھا کہ قی وحر نے کو جگہ نہ تھی۔

”یہ اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے ہیں؟“

اشفاق نے اس سوال پر میں نے کہا۔

”نئی سوال میں نے ایک رکشا ڈرائیور سے کہی تھا۔ میں ریڈیو

سٹیشن سے سمن آہلو جا رہا تھا۔ گری بیٹی سخت پڑ رہی تھی۔ سڑک

چوڑی پر گاڑیوں کی لائن لگی تھی۔ ہمارا رکشا بھی سڑتی کے انتظار

میں لائن میں لگ گیا۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے پوچھا کہ اجے

لوگ کہاں سے آگئے ہیں؟ اس پر رکشا ڈرائیور نے جواب دیا۔

آپ ان سب لوگوں کی موم شادی کر کے دیکھیں اگر یہ ند ہزار

آوی ہیں تو ان میں سے ایک ہزار ساڑھے آٹھ سو آوی دو سرے

بھوٹے چھوٹے شہروں اور گاؤں سے ہوں گے۔ لاہور کے آوی

چند ایک ہی ہوں گے۔ باہر کے آویہاں نے آکر یہاں اٹکا ہجوم کر

دیا ہے۔"

اشفاق بولا۔

"یہ بات کسی حد تک عجیب ہی لگتی ہے۔"

اشفاق مکمل کیا۔ ہم نے گاڑی مال پر ڈال دی۔ بائیں جانب دھڑی فوٹو گرافری دکان کو دیکھ کر اشفاق کہنے لگا۔

"یہ شخص بھی کمال کا فوٹو گرافر تھا۔ خدا کرے اب بھی ہو۔"

اس کے ساتھ والی دکان میوزیم کی تھی۔ مجھے یاد آگیا کہ قیام پاکستان کے زمانے میں میں اور انور جلال ٹھہرا اسی دکان پر آکر بالیوایا کرتے تھے۔ یہاں ایک کارپنٹر بڑے کمال کا ہوا کرتا تھا۔ ایسے بال بناتا تھا کہ بال بھولنے بھی ہو جاتے تھے اور معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ حجامت کی گئی ہے۔ اس زمانے میں بال کٹوانے کے پانچ روپے لگتے تھے۔ اس سے ذرا آگے ایک اندر کوٹھی ہوئی لمبی دکان تھی۔ یہ دکان ہمارے امرتسر کے ایک زیورینگل کشمیری فرجوان پشیر کو الاٹ ہوئی تھی۔ یہ پشیلوں کا بیڑوں وغیرہ کی دکان ہوا کرتی تھی۔ دکان میں ابھی تک مال بھرا ہوا تھا۔ میں وہاں کبھی کبھی جاتا تو شیر مجھے دیکھ کر بوا خوش ہوتا۔ سب گھروالوں کی شیر خیریت دریافت کرتا۔ پھر دکان کی چھت تک چڑھے ہوئے لکڑی کے بھرے ہوئے خانوں پر ایک نظر ڈال کر کہتا۔

"سمجھ میں نہیں آتا اچھے سارے مال کو میں کیسے فروخت کروں گا۔

میں تو اس دکان کو ہی بچ کر کشمیر چلا گیاؤں گا۔ یہاں کیا پڑا ہے۔

گرمی ہی گرمی ہے۔"

اس سے ذرا آگے ایک دکان میں گارڈینا نام کا رستوران ہوا کرتا تھا۔ نیم روشنی، ٹھنڈا، ٹھنڈا رستوران۔ بہت کم گلابک اندر بیٹھے ہوتے۔ چیرے چل کر میز کے پاس آتے تو ان کی آواز تک نہ آتی تھی۔ یہ رستوران ابھی ختم ہو گیا۔ وقت کی آمد ہی اسے بھی اڑا کر لے گئی۔ ہم ریگل سینما کا ہونک کراس کر کے "راستہ گویا" والی فلی میزک پر آئے تو یہاں گزرتے کے

لئے جگہ ہی نہیں تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"گاڑی ریگل سینما کے احاطے میں لگا دو یہاں سے پیدل چلتے

ہیں۔"

اس نے یہی کیا۔ ریگل سینما کے باہر اگر کوئی شے دیکھی تھی تو وہ پھول بیچنے والوں کی گلاب، گلابیے اور دوسرے رنگت رنگ پھولوں سے بھری ہوئی باٹھیاں تھیں۔ آج سے چالیس سال پہلے بھی ان پھول بیچنے والوں کے پاس کوئی دکان نہیں تھی۔ ریگل سینما کے گیٹ کے باہر پھولوں کی ٹوکیاں اور باٹھیاں سجا کر بیٹھے ہوتے تھے اور آج بھی وہ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھے پھول بیچ رہے ہیں۔ ریگل سینما کے گیٹ کی دوسری طرف جہاں اب کنہیوں کی دکان ہے ابھی شیراز رستوران ہوا کرتا تھا۔ یہاں کبھی کبھی میں اور اشفاق آ کر چائے پیا کرتے تھے۔ پھر اس کا نام پائو کیف ہو گیا۔ اس کا مالک پال نام کا ایک ہماری بھرم باکسر ٹائپ کا آدمی ہوا کرتا تھا۔ وہ شام کو رستوران کے باہر گرمی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ دوسری کرسی پر مائیں بیٹھتا رہتا اور دل پر کبھی کبھی گزرتے والی موٹر کاروں کو ٹکنا رہتا۔ پھر نہ جانے وہ کہاں ٹائپ ہو گیا۔ اس کے ساتھ سفید ساڑھی اور اداس چہرے والی ایک خاتون بھی بیٹھا کرتی تھی۔ وہ بھی پھر نظر نہیں آتی۔ اس کے آگے ایک بوا سدر ہے۔ یہاں پہلے سینڈوڈ ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں پہلے پہل انجیل نام کی ڈانس ڈانس کیا کرتی تھی۔ انجیل بعد میں میڈو ہوٹل میں ڈانس کرنے لگی تھی۔ سینڈوڈ ہوٹل میں شراب کے جام بھی چلتے تھے۔ شراب سے مجھے یاد آ گیا۔ گوالڈی کے چوک میں ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد ہم یہاں آئے تو میں نے دیکھا کہ اس ہوٹل کے باہر ایک یورڈ لگا تھا جہاں اردو میں لکھا ہوا تھا۔

"یہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت ہے۔"

اسی طرح جی پی او کے سامنے لائیڈ ونگ والی بلڈنگ کے اوپر بہت بڑا

یوں سانس لگا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

”مری بیٹھ بھریں بیٹھ ہے۔“

اب نہ وہ مری کی بیکری نہ سینڈرو ہو بل رہا نہ سینڈرو ہو بل کی
ڈانسرانچہ لہی رہی۔ جو رہی تو بے خبری رہی۔

ہم پھیل بیچنے والوں کے پھولوں سے جدا ہو کر داستان گو دفتر کے
سامنے والے بس سٹاپ پر آ کر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ افغان جس
چلا۔

”یار! ہمارا چھوٹا شاہ نشین ٹائپ کا دفتر تو بالکل عین ویران ہو گیا

بیٹھ۔“

وہاں اٹھ جانے کس نے اپنا دفتر یا دفتر کا گوام بنایا ہوا تھا۔ دفتری تنگ
میز وہاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ یہ میز حیاں دوستی منزل پر روزنامہ

”اتفاق“ کے دفتر کو بھی جاتی تھیں۔ یہ 1952ء کی بات ہے۔ میں روزنامہ

”اتفاق“ کے دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ پہلے میری بیوی دن کے وقت اخبار کے

دوسرے تہرے صفحے پر ہوا کرتی تھی۔ میرے ساتھ ناصر کاظمی اور علی منیان

آدھی بھی ہوا کرتے تھے۔ ”اتفاق“ اخبار میں اتفاق کے نام سے کالم لکھا کرتا

تھا۔ پھر میں رات کی شفت میں چلا گیا۔ یہ شتم نبوت کی تحریک کا زمانہ تھا جب

مال پر بڑی گولی چلی تھی۔ رات کو کرفو لگا تھا۔ میں نے پاس ہوا رکھا تھا۔ پھر

بھی رات کو ایک بجے گھر واپس جاتے ہوئے اور لگتا تھا کہ کسی طرف سے گولی

گولی نہ آجائے۔ اتفاق تلے سر کو ہلکا سا جھٹک کر کہا۔

”چلو یار! واپس چلتے ہیں۔ ان کھڑوں میں کب تک بھرتے رہیں

گئے۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی ایک تاریخی کھڑکی سیر رہی ہے۔“

”وہ کونسا کھڑکی ہے؟“

”پاک ٹی ہاؤس۔“

اشفاق بے اختیار خوش ہو کر بولا۔

”ہاں یار! وہاں ضرور چلیں گے۔ چلو۔“

ہم نے گاڑی نکالی اور پاک ٹی ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ پاک ٹی

ہاؤس کے سامنے ہر درخت تھا وہ پہلے سے بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی جھکی

شاخوں نے سڑک پر سایہ کر رکھا تھا۔ ٹی ہاؤس بھی زبان حال سے اپنی جھکی و

جھکی کی داستان سنا رہا تھا۔ فرش کی ٹائلیں جہاں سے اکھڑ گئی تھیں وہاں پلستر

بکھیر دیا گیا تھا۔ چند ایک میزوں پر ابھی چھوٹے لوگ بیٹھے تھے۔ سراج

صاحب کے بیٹے ہمیں پہچان لیا۔ وہ کھڑکھڑا کر ہمارے پاس آیا۔ اس کا

چہرہ وہ فور مسرت سے چمک رہا تھا۔

”تو بے قیاس کہ آپ پاک ٹی ہاؤس میں آئے۔“

میں نے کہا۔

”یار! جانے ہی پرانے پاک ٹی ہاؤس والی جگہ۔“

”اس سے بھی اعلیٰ چائے آئے۔“

پھر اس نے کسی بیڑے کو آواز دی۔ بیڑا آگیا۔ کسی پرانے بیڑے کی

صورت اس میں نظر آرہی تھی۔ معلوم ہوا کہ لال ٹائی بیڑے کا بیڑا ہے۔ وہ

بڑے اہتمام سے چائے لے کر آیا۔ مگر یہ وہ چائے نہیں تھی جو کبھی ہم وہاں پیا

کرتے تھے۔ اشفاق قیشے کی روبرو والی سیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”جسٹس یاد ہے یہاں شہرت بخواری قوم نظر حبیب جالب انجم

رومانی اور امجد الطاف بیٹھا کرتے تھے۔“

ہم کھڑکے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔

”اور یہاں ناصر کاظمی میرے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ رشقا وہ بھی قوم

نظر والی ٹولی میں تھا مگر جس روز اس نے تازہ غزل کہی ہوئی تھی تو

مجھے ساتھ لے کر اس میز پر آجائے تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی

ہوتی تھیں۔ وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ لگا کر مجھے کہتا۔ تمہیں

اپنی تازہ غزل سنا رہیوں۔۔۔

میں نے اوپر گیلری کو جاتے رہنے کو دیکھا۔ زینہ خالی تھا اور گیلری بھی خالی تھی۔ رہنے کے پاس بھی ایک میز لگی تھی۔ مجھے یاد آگیا۔ ایک بار گرمیوں کی دوسرے کو میں اس میز پر بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ شہرت بخاری، قیوم اختر اور محمود جیلانی بھی ایک سیڈنٹ بھی تھا جس کا تعلق ٹنگری سے تھا اور جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں ہی رہتا تھا۔ محمود جیلانی بڑا ادب پرست فوجیوں کا تھا۔ اسے میں پاک فی ہاؤس کا دروازہ کھلا اور معاونت حسن منٹو نے اندر بھانک کر دیکھا۔ یہ منٹو صاحب کی زندگی کے آخری لغو شاٹک ایام تھے۔ یہ منٹو پورے کا پورا مکمل تفصیل کے ساتھ سرج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ شہرت بخاری نے منٹو صاحب کو دیکھا تو گھبرا کر کہا۔

”اوسے منٹو صاحب آگئے ابھا کو اوہ پیسے کا نکلیں گے۔“

قیوم اختر اور شہرت بخاری جلدی سے اٹھ کر اوپر گیلری میں چلے گئے۔ میں اور محمود جیلانی وہیں بیٹھے رہے۔ اس دوران منٹو صاحب ہماری میز پر پہنچ گئے تھے۔ غالباً وہ محمود جیلانی کو دیکھ کر وہاں آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی محمود جیلانی سے پوچھا۔

”تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟“

محمود جیلانی نے بیٹے ادب سے ہنہ کھول کر ان کے آگے رکھ دیا اور

کہا۔

”منٹو صاحب! یہ سارے پیسے آپ ہی کے ہیں۔“

مجھے یاد ہے ہٹوے میں دس روپے کے کتنے ہی نوٹ ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ منٹو صاحب نے ان میں سے ہر نوٹ نکال کر رکھ لئے اور

کہا۔

”بس میں روپے کافی ہیں۔“

اور جس قدموں سے چل کر وہاں آئے تھے انہی قدموں سے چلنے کی ہاؤس سے باہر نکل گئے۔ ان دنوں جم خانہ شراب کا ادھا چوہہ روپے میں آیا کرتا تھا۔ ہم دیر تک فی ہاؤس میں بیٹھے گزرے زمانے کو گزرے ہوئے زمانے کے چروں کو یاد کرتے رہے۔ کیسے کیسے لوگ تھے کیسے کیسے چلیے چرے تھے جو ادب کے آسمان پر ستارے بن کر چکے اور پھر اپنے پیچھے روشنی کی کیریں چھوڑ کر نظروں سے بیک وقت غائب ہو گئے۔ کبھی فی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھے گلدان میں تر گیس اور گلاب کے پھول مکا کرتے تھے۔ شیشے میں سے ان پر سرریوں کی دھوپ پڑتی تو وہ نکل کے بلب کی طرح روشن ہو جاتے۔ اب کاؤنٹر پر نہ گلدان ہے نہ گلدان کے پھول ہیں۔ صرف میں اور اشتیاق احمد میز کے آگے ماسے سر جھکا کر بیٹھے پرانے دنوں کو یاد کر رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ اس میز پر کوئی اور بیٹھا نہیں یا اگر رہا ہوگا۔

اے حمید

26-7-95